Registered No. L. 5340

جلد ۳۲
عدد ۱

رجب ۱۳۶۹ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک' اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے۔ برائے پاکستان قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
" سات روپیہ آٹھ آنے برائے ہندوستان " گیارہ آنے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	-/۸	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-		
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت، بناؤ بگاڑ	فی -/۶/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریۂ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
سلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
الدین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ ـ الف ذیلدار پارک ‘اچھرہ’ لاہور (پاکستان)

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۴	رجب ۱۳۶۹ھ	مطابق	ماہ جون ۱۹۵۰ء	عدد ۱

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"قارئین ترجمان القرآن" تک یہ مبارک اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب جو پاکستان میں نظام اسلامی کے قیام کی کوشش کرنے کے جرم میں کسی عدالتی تحقیقات کے بغیر نظر بند کیئے گئے تھے، بیس ماہ کے بعد حکومت کی طرف سے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ رہائی کی فوری وجہ تو لاہور ہائیکورٹ کا یہ رولنگ تھا کہ سیفٹی ایکٹ کے تحت کسی شخص کو مسلسل اٹھارہ ماہ سے زائد نظر بند نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ رائے عام کا دباؤ بھی اپنا کام کر رہا تھا اور حکومت گذشتہ دو تین ماہ سے ان حضرات کی رہائی کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن ہم ان سارے وجوہ سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب اللہ کے نزدیک ان حضرات کا جیل جانا تحریکِ اسلامی کی ترقی کے لئے ضروری قرار پایا تو یہ نظر بند کر دیئے گئے اور جب تحریک ہی کا یہ اقتضا ہوا کہ انہیں باہر آنا چاہیئے تو جیل کے پھاٹک از خود کھل گئے۔ بہرحال ساری ملت کے لئے یہ ایک مبارک موقع آیا ہے اور ہم اس کے آنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ترجمان کی ادارت ایک ایسی ذمہ داری تھی جسے مولانا سید ابوالاعلےٰ مودودی مدظلہٗ اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی غیر حاضری میں طوعاً و کرہاً سرانجام دینا پڑا ہے، ورنہ راقم الحروف اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے اس کا اہل کبھی نہ تھا اور یہ بوجھ میرے لئے ہمیشہ موجبِ تشویش رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ترجمان القرآن کی ادارت

اہلِ ہاتھوں میں منتقل ہو اور قارئین کی طرح راقم الحروف بھی اس سے ذہنی و روحانی روشنی حاصل کرے۔

نعیم صدیقی

اِن سطور میں ہم اس طبقے کی اُن تمام ذہنی گرہوں کو کھول دینا چاہتے ہیں جو دین و سیاست کی تفریق کے غیر اسلامی نظریئے نے ڈال رکھی ہیں۔

چھٹی صدی ہجری تک دین و سیاست کے درمیان جو آویزش بپا رہی تھی، اس نے ایک فیصلہ کن انجام پر پہنچنے کے بعد دین کو زندگی سے الگ ہٹا کر جامد مذہبیت کے سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس دور کے بعد سے لے کر اب تک جامد مذہبیت مسلسل ارتقاء کرتی رہی ہے اور بعض اکابر علمائے امت نے جو اصلاحی و انقلابی کوششیں سرانجام دیں وہ حالات کا رُخ بدلنے میں ناکام رہ گئیں۔

جامد مذہبیت کے فروغ پانے کے بعد مسلمان کے ذہن سے یہ بات تو بالکل نکل ہی گئی کہ اسلام کی دعوت میں کوئی انقلابی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس کا طریق کار ایک بڑھنے اور پھیلنے والی تحریک کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہ شعور بالکل ختم ہو گیا کہ اسلام نظامِ سیاست و تمدن کو اپنے نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے وہ قیادت و اقتدار کی باگ ڈور پر بلا شرکتِ غیرے مکمل قبضہ چاہتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے سرپرستوں نے اسلام کو نظامِ کفر کے سائے میں ایک پُر امن اور وفادار خادم کے مقام پر گرانے کی کوشش کی اور اسے ہر قسم کے ماحول میں "بے ضرر" دھرم بنا کر رکھنے کے لئے اپنی قوتیں صرف کر دیں۔

اس طرح جب "تحریکیت" کے بجائے اسلام میں جامد مذہبیت کے انداز پیدا کر دیئے گئے تو پھر دین کی دعوت، دینی نظم جماعت، دینی تحریک، دینی مقاصد، دینی طریق کار وغیرہ کے مفہوم میں بھی جمود سرایت کر گیا اور دینداری اور جمود باہم لازم و ملزوم ہو گئے۔ جن حضرات نے ایک طویل محنت کے بعد یہ صورتِ حالات پیدا کی ہے اُن کے سامنے اسلام کا ایک ایسی تحریک بن کے ابھرنا جو قوت کی باگ ڈور سنبھال کر زندگی کی ساری کارگاہ کو نئے انداز سے منظم کرنا چاہتی ہے، ایک ایسی انوکھی صورتِ حالات ہے جس سے

خواہ مخواہ اُپجاتے ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حرکت و عمل کا یہ سارا طوفان ایک ہنگامۂ دنیویت ہے اس میں دین کی اصل رُوح کارفرما ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نشوونما پاتی ہوئی تحریک پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی آنکھوں پر انہیں چند خاص اصطلاحات کی رنگین عینکیں لگا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں جو جامد مذہبیت کے تنگ تصورات کی حامل ہیں۔ ان تنگ تصورات کے تنگ پیمانوں سے جب وہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کو ماپنا چاہتے ہیں تو یہ پیمانے چھلک جاتے ہیں اور وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ:-

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ		جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

پس اُن کے لئے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اُن کے مخصوص دینی پیمانوں سے جس دینداری کو نہیں ناپا جا سکتا وہ بھی مستند دینداری ہو سکتی ہے، بلکہ ان کے نزدیک جو کچھ جامد مذہبیت کے پیمانوں سے چھلک کے باہر گر جائے اسے لازماً دنیویت ہونا چاہیئے۔

اس طرح کے محدود مذہبی تصورات کو ذہنوں میں جگہ دے کر یہ سمجھنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ ایک نشوونما پاتی ہوئی تحریک کس طرح چلا کرتی ہے، اسے ہر ہر قدم پر کس طرح نو بہ نو مراحل پیش آتے ہیں اور وہ انہیں کن کن طریقوں سے حل کرتی ہوئی آگے بڑھا کرتی ہے۔ اگر جامد مذہبیت کی بنیادی گرہ کھل جائے تو پھر باقی ساری گرہیں خود بخود کھل سکتی ہیں۔ اسلام کے تحریکی مزاج کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر اس حقیقت کا فہم کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ دین کی علمبرداری کرنے والے کسی کارواں کا راستہ کن کن وادیوں سے ہوتا ہوا اور کون کون سے موڑ مڑتا ہوا آخری نصب العین تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اب ضروری ہے کہ ہمارے دینی حلقوں کے حضرات اسلام کی راہِ عمل اور اس کے مراحلِ کار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تحریکی فطرت کو پیشِ نظر رکھیں۔

جامد مذہبیت نے دعوتِ دین کی اصطلاح کو مروجہ تبلیغ کا محدود مفہوم دے کر جس سطح پہ گرا دیا ہے، وہ اسلام کے تصورِ دعوت و تبلیغ سے بہت ہی پست ہے۔ بخلاف اس کے جماعت اسلامی "دعوت" کی اصطلاح کو اُس کے جامع مفہوم کے ساتھ اپنے پیشِ نظر رکھتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف چند ابعد

الطبیعی عقاید اور فقہی جزئیات پر وعظ کہنے اور انفرادی گفتگوئیں کر لینے کا پروگرام نہیں ہے، بلکہ ہماری دعوت اقامتِ دین کی دعوت ہے۔ ہم ایک غلط نظامِ زندگی کو اسلامی نظامِ زندگی میں بدلنے کے داعی ہیں۔ ہماری دعوت کا خطاب صرف افراد ہی سے نہیں، بلکہ معاشرے کے مجموعی وجود اور تمدن وسیاست کے ہمہ گیر اداروں سے بھی ہے۔ اس طرح کی وسیع عملی دعوت کے تقاضے صرف وعظ گوئی سے پورے نہیں ہو سکتے بلکہ یہ دعوت اذان سے رجز تک کے سارے مراحل کو محیط ہے۔ یہ دعوت صرف لفظوں ہی سے نہیں دی جا سکتی بلکہ اس کی صداقت کی گواہی عمل وکردار کے مظاہرے سے دینی ناگزیر ہوتی ہے۔ پھر یہ دعوت منتشر افراد کے ذریعے اپنے مقاصد کو نہیں پہنچ سکتی، بلکہ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے تنظیم جماعت کی متقاضی ہے۔ کبھی یہ دعوت ناصحانہ پیرایے میں دینی پڑتی ہے، اور کسی موقع پر ناقدانہ پیرایے میں، کبھی اس کے لئے نرم سے نرم انداز ڈھونڈ کے لانا پڑتا ہے اور کبھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ گرم سے گرم پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے۔ یہ دعوت ایک طرف تعاون علی البرّ کے لئے الفت وشفقت سے اپیل کرتی ہے اور دوسری طرف یہی وغلظ و نغزاك من يغيظ کا مظاہرہ کرنے کے لئے غلظت وشدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ پھر یہ پہلے قدم پر جو کچھ ہوتی ہے، دوسرے قدم پر اس سے زیادہ وسعت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر ہر قدم پر کسی نئے انداز میں اور زیادہ زور دار ہمہ گیری کے ساتھ نمودار ہوتی ہے —— یہاں تک کہ پورے معاشرہ پر چھا جائے۔ یہ دعوت لڑاتی بھی ہے۔ اور صلح بھی کراتی ہے، یہ توڑتی بھی ہے اور جوڑتی بھی ہے، اور مختلف احوال ومنزلوں سے گذرتی ہوئی اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔

اجتماعی انقلاب کی دعوت دینے والی کوئی بھی جماعت ہو —— اسلامی یا غیر اسلامی —— درحقیقت اس کا وجود ہمہ تن دعوت ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنا ابتدائی تعارف کرا رہی ہو، اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی مخالف طاقتوں پر تنقید کر رہی ہو، اور اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ برسرِ اقتدار طاقتوں کے خلاف چارج شیٹ لے کے میدان میں آئے۔ کسی جماعت کا ایک اصول کے ساتھ موجود ہونا، اس اصول کی کسوٹی پر پیشِ نظر حالات کو پرکھنا، اس کے مطابق مختلف مسائل میں رائے دینا، اس اصول کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر نظامِ زندگی کی تبدیلی کا کوئی پروگرام پیش کرنا، اس

اُصول کا حق ادا کرنے والی قیادت کو برسرِ عمل لانے کی کوشش کرنا، یہ سب کچھ ہمہ تن اُس اصول کی طرف دعوت دینے کا ایک وسیع الاثر نظام کار ہے۔

بالکل اسی طرح جماعت اسلامی کا ایک اصول کی علمبردار جماعت کی حیثیت سے موجود ہونا، اور مختلف سرگرمیوں میں اس اصول کا مظاہرہ کرنا تمام تر دعوتِ دین ہے۔ اُس کا لٹریچر، اُس ، اس کے پوسٹر، اُس کے جلسے، اُس کے ریزولیوشن، اُس کے بیانات، اُس کی تنقیدیں، اس کے احتجاج، اس کے مظاہرات، اُس کی پالیسی، اُس کی مجلس شوریٰ کے فیصلے، اس کے ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی اور سالانہ اجتماعات، اس کی سوشل خدمات، اس کے کارکنوں کے ادبی حلقے، وغیرہ از سرتاپا اپنی مجموعی حیثیت سے اقامتِ دین کی دعوت ہیں۔ ایک اجتماعی انقلاب کی علمبردار جماعت کی سرگرمیوں کا مجموعہ دعوت ہوتا ہے، نہ یہ کہ دعوت اس کی سرگرمیوں کا ایک جزو ہو۔

جن اصحاب پر دعوت کا یہ تصور اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ واضح نہیں ہے، اُن کو جماعت اسلامی کی بہت سی سرگرمیاں دعوت کے ماوراء، بلکہ دعوت سے متضاد معلوم ہوتی ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوتِ دین کو پس پشت ڈال کر یا اسے ایک گونہ کمزور کر کے کچھ دوسرے سیاسی کام کئے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے حضرات جماعت اسلامی کی دعوت کے کسی نئے مرحلے میں داخل ہونے پر بہت اُپراتے ہیں کہ یہ کیا ہونے لگا۔ چنانچہ جب جماعت "مطالبۂ نظام اسلامی" کی ابتدائی تحریک لے کے آگے چلی تو بھی ان کو کھٹک ہوئی، پھر جب انقلاب قیادت کی صدا بلند کی گئی تو اُس وقت بھی ان کو الجھن ہوئی، پھر جب شرکتِ انتخابات کا فیصلہ کیا گیا تو بھی ان کو شکایت ہوئی کہ جماعت دین سے سیاست کی طرف ڈھلک گئی ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس اب جب "احتجاجی مظاہرے" کا نیا مرحلہ سامنے آیا تو اس پر ان حضرات کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کجا دعوتِ دین اور کجا احتجاجی مظاہرے! حالانکہ یہ سب کچھ عین جائز اور حق ہے اور یہ سب کچھ دعوتِ دین سے الگ نہیں۔

یہ دعوتِ دین کا تصور جب تک درست ہو کر اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ذہنوں میں جاگزیں نہ ہوگا ہمارے بہت سے معترضین اور خیرخواہ جماعت اسلامی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے پر قادر نہ ہو سکیں گے۔

خدا جانے کہاں سے یہ عجیب و غریب تخیل بھی دلوں میں آ گھسا ہے کہ جو دین کی دعوت دے، وہ بس دعوت ہی دے، کچھ اور نہ کرے۔ ایک داعی جماعت کے لئے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اقتدار پر تنقید کرے یا اس سے کسی اجتماعی حق کا مطالبہ کرے، یا اس کے مظالم کے خلاف احتجاج کرے۔ اس نظریے کے لئے خود دین میں کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ بھی ایک نتیجہ ہے جامد مذہبیت سے متاثر چلے آنے کا۔

جہاں تک تنقید ـــــ اور بالخصوص وقت کی قیادت پر تنقید کا تعلق ہے، یہ ہمیشہ دعوتِ اقامتِ دین کا ایک جزو رہی ہے، اور اربابِ اثر و اقتدار پر پبلک کے سامنے چارج شیٹ مرتب کر کے لانے کا کام تاریخ دین میں کوئی انوکھا کام نہیں ہے، بلکہ خود انبیاء علیہم السلام ہی نے اس ناخوشگوار فریضے کو ادا کر کے ہمارے لئے مثالیں قائم فرما دی ہیں۔ اس معاملے میں بہترین نظیر آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُن تنقیدوں میں ملے گی جو دعوت الی اللہ کے ساتھ ساتھ آپ نے وقت کے احبار و رہبان پر کی تھیں جن کے ہاتھوں میں رائے عام کی باگ ڈور تھی۔ پھر آپ کو اس کا واضح اور جامع نمونہ نبی صلعم کی دعوت میں ملے گا کہ آپ کی زبان سے جو الہامی خطبے نشر ہوئے تھے ان میں قریشِ مکہ کی معاشرتی لیڈر شپ، متولیانِ کعبہ کی مذہبی قیادت، شعراء و خطبائے قریش کی فکری و ادبی پیشوائی، سود خوارانِ مکہ کی معاشی سربراہ کاری، کاہنوں اور نجومیوں کے عالمِ تصوف کی عنان برداری اور اہل کتاب کی فقہی امامت پر انتہائی کڑی تنقیدیں موجود ہیں، بلکہ قرآن کی بعض سورتیں ان مقتدر عناصر کے خلاف کھلے کھلے چارج شیٹ بن کر نمودار ہوئی ہیں۔ اسی تنقید نے مخالفین تحریک اسلامی کے اخلاقی موقف کو کھوکھلا کیا، تب کہیں جا کر تبدیلی کے لئے راستے ہموار ہوئے۔

علاوہ بریں آپ اگر اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ صلحائے امت نے خلفاء و سلاطین پر بہت ہی بے لاگ تنقیدیں کی ہیں اور پھر اپنے جرمِ صاف گوئی کی خوفناک سزائیں برداشت کی ہیں، لیکن وہ کبھی اس پر راضی نہیں ہوئے کہ محض توحید و رسالت کے عقائد کی تلقین کر دینے پر اکتفا کریں اور پھر یہ سمجھ بیٹھیں کہ دعوتِ دین کا حق ادا ہو گیا۔ دور نہ جائیے، یہیں اپنے ملک کے اندر شاہ ولی اللہ دہلوی

کے علمی کارنامۂ دعوت کا جائزہ لیجئے، اس میں آپ کو حکمرانوں اور عوام کے تمام طبقات کے متعلق انتہائی تلخ تنقیدیں ملیں گی اور یہی حال شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کی تحریروں کا ہے۔

عین اسی طرح خود مطالبہ بھی تحریکِ اسلامی کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک طرف فرعون کے دربار میں خالص توحید کی دعوت دے کے جاتے ہیں، لیکن دوسری طرف وہی حضرت موسیٰ ہیں کہ ارسل معی بنی اسرائیل کا مطالبہ لئے ہوئے مصروفِ تقاضا نظر آتے ہیں، اور اس مطالبے کو منوا کے چھوڑتے ہیں۔ یا کوئی شخص گمان بھی کر سکتا ہے کہ خدا کے نبی نے دعوتِ دین کو پسِ پشت ڈال کر ایک سیاسی مطالبے کو اپنا مقصود بنا لیا تھا؟ نہیں یہ مطالبہ خود دعوتِ دین ہی کے تضمنات میں شامل تھا۔ بالکل اسی طرح دعوت کو لے کر چلتے ہوئے احتجاج اور مظاہرے کی منازل بھی آسکتی ہیں، یہاں تک کہ خدا کے انبیاء کو دعوت دیتے دیتے دنیا نے اس حال میں بھی دیکھا کہ تلواریں لئے عرصۂ پیکار میں وہ فریضہ انجام دے رہے ہیں جو دعوتِ اسلامی کے پاکیزہ نصب العین کے تحت لازم نہ ہو جائے تو دنیا کا مکروہ ترین فعل ہوتا ہے۔

پس دعوت کے غلط تصور اور تبلیغ کے غلط ذوق کی عینک سے اگر جائزہ لیا جائے تو پھر نتیجہ یہی ہوگا کہ وعظ و تلقین کے علاوہ جو کچھ بھی ایک تحریک سے صادر ہو وہ اس کی داعیانہ حیثیت کے منافی قرار پائے

درحقیقت، یہ بات پلّے باندھ لینے کی ہے کہ دعوتِ دین کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نظام کو برپا کرنے کے لئے جتنے لوازم درکار ہوں ان کو فراہم کیا جائے اور جتنی رکاوٹیں حائل ہوں ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ان دونوں مقاصد کے لئے جائز حدود میں جو جو کچھ بھی اقدام کئے جائیں گے وہ سب دعوتِ دین کی تعریف میں داخل ہوں گے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اقدام دعوت کو پسِ پشت ڈالنے والا ہے۔

یہ ہے صحیح تصورِ دعوت، اور اس تصورِ دعوت کے ساتھ کام کرنے والی جماعتوں اور تحریکوں کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

———— ✻ ————

کچھ حضرات کو خاص طور پر "احتجاج" تحریکِ اقامتِ دین کے مزاج سے ناسازگار محسوس ہوتا ہے بلکہ وجہ وہ اس بات کو لازم سمجھتے ہیں کہ ظلم کو بہر حال چپ چاپ سہنا چاہئے اور اس کے خلاف رائے عام کو تیار کرنے یا اقتدار کو اس سے باز رکھنے کے لئے کسی طرح کی جنبش نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں بھی دعوے بلا دلیل ہے۔

اوّل تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اسلامی نظام کے سوا ہر نظامِ زندگی ایک مجسم و منظم ظلم ہوتا ہے اور اس ظلم کے خلاف تحریکِ اسلامی کا عین وجود ہی یکسر احتجاج ہوتا ہے۔ دوسری حقیقت یہ بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ظلم کرنے والے کو ظلم کرنے کے لئے کھلی چھٹی دیئے رکھنا دین کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ ظالم کا اگر ہاتھ پکڑا جا سکتا ہو تو ہاتھ پکڑنا چاہئے اور اگر زبان ہی سے اسے ٹوکنا ممکن ہو تو زبان سے ٹوک دینا چاہیئے اور اگر اس کی بھی ہمت نہ ہو تو جب تک یہ حالت قائم رہے دل سے ظلم کے خلاف نفرت کرنا لازم ہے ـــــ اور حدیثِ نبوی کی رُو سے اسے ظالم بھائی کی خیر خواہی اور مدد کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے ظالم کو ظلم کی اجازت دے دینا اور کسی قسم کے احتجاج کی طاقت رکھتے ہوئے آواز نہ اٹھانا ظلم کے فروغ میں مدد دینے کے برابر ہے۔ خود قرآن نے بدیں الفاظ ہر انسان کو حقِ احتجاج دیا ہے کہ:۔

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم۔ — اللہ کسی کی زبان سے برائی کی پکار کو پسند نہیں کرتا' بجز اس کے جو مظلوم ہو۔

یعنی اسلام نے مظلوم فرد، مظلوم جماعت، مظلوم معاشرے اور مظلوم قوم کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والی طاقتوں کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرے۔ اس میں کسی طرح کی شرعی رکاوٹ نہیں ہے فی نفسہٖ احتجاج بالقول کا حق خدا کے انبیاء نے بھی استعمال کیا ہے چاہے اُس کا پیرایہ کچھ بھی رہا ہو۔ مثلاً:۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے جب آزادی کے بند دروازے کھولے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ اُس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو اُن پر روا رکھا گیا تھا' چنانچہ وہ پورے معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور فرعون کے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں کہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن۔ چنانچہ آپ کی بے گناہی نکھر کے سامنے آجاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے احسان جتانے پر یہ احتجاجی فقرہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

تلك نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل ۔ تیری کرم فرمائی جس کا مجھ پر تو احسان دھرتا ہے، یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے ۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جب بے حیائی پر تل جاتی ہے تو آپ اسے مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

الیس منکم رجل رشید ؟ کیا تم میں کوئی ایک سنجیدہ آدمی بھی باقی نہیں رہا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب وقت کے اقتدار پرست مفسدین کا ایک غول گرفتار کرنے آتا ہے تو وہ اسکے طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کے لئے یہ فرماتے ہیں کہ جب میں ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیا کرتا تھا تو اس وقت تو تم نے مجھے نہ پکڑا، لیکن آج تم لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح مجھے گرفتار کرنے آئے ہو!

پھر ایرانی دربار میں جب نبی صلعم کے قاصدوں سے مساواتِ انسانی کے خلاف سلوک کیا گیا تو انہوں نے وہیں بھرے دربار میں اس طرزِ عمل کے خلاف اپنے جذباتِ حقارت کا پوری بے باکی سے اظہار کر کے اتمامِ حجت کر دیا۔

پس احتجاج کو تحریکِ اسلامی سے فی نفسہٖ کوئی منافات نہیں ہے ۔ ایک اسلامی تحریک کا احتجاج خود دعوت بن جاتا ہے اور اُس کے ذریعے حکومت اور رائے عام دونوں کے سامنے حق واضح ہوتا ہے اور باطل کی تردید ہوتی ہے!

سوال صرف احتجاج تک محدود نہیں ہے، بلکہ دین کے بہت سے رمز شناسوں کو اصل اختلاف احتجاجی مظاہروں سے ہے ۔ مظاہرہ ان حضرات کے لئے ایک غیر دینی سی کارروائی ہے یا دنیوی سیاست کا ایک طریق کار ہے۔ یہ احساس بھی درحقیقت اسی بنیادی تصورِ دین و سیاست کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ قابلِ غور یہ ہے کہ مظاہرے کی اصل حقیقت کیا ہے ؟

ایک ہوتا ہے فرد کا احتجاج کسی فرد کے ظلم کے مقابلے میں، دوسری طرف ایک جماعت کا احتجاج ہوتا ہے کسی نظامِ اجتماعی کی زیادتیوں کے خلاف، اور ان دونوں کی حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ظالم فرد کے ظلم کا دائرہ محدود ہوتا ہے لیکن ظالم نظام کے ظلم کے اثرات دور رس ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مظلوم فرد کی مظلومیت کے مقابلے میں ایک جماعت اور ایک قوم کی مظلومیت بہت بڑے درجے کی ہوتی ہے ۔ آخرالذکر کی لپیٹ میں ہزاروں افراد بلکہ پورے ملک کا مفاد آتا ہے

اس فرق کے پیش نظر ایک فرد کے محدود احتجاج کے مقابلے میں ایک جماعت کو وسیع تر احتجاج کرنا پڑتا ہے وہ ظلم کی مدافعت کیلئے ایک قوم کی قوم کے جذباتِ ہمدردی کو اپیل کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ چنانچہ فرد کا احتجاج اگر دو چار تلخ جملے کہہ دینے سے پورا ہو جاتا ہے تو ایک جماعت کو اسی مقصد کیلئے سینکڑوں تقریریں نشر کرنی پڑتی ہیں، فرد ایک خط یا درخواست لکھ کر یا اخبار میں ایک مراسلہ شائع کر کے جس مقصد کو حاصل کر لیتا ہے، ایک جماعت اس کو حاصل کرنے کیلئے سینکڑوں لٹریچر، محضرناموں، ہینڈبلوں اور کتبات (Placards) کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتی ہے، فرد کے لئے دو چار آدمیوں سے مل کر جذبات کا اظہار کر دینا نتیجہ خیز ہو سکتا ہے لیکن جماعت کو پوری کی پوری قوم کے سامنے اپنے جذبات کی وضاحت کرنی پڑتی ہے، فرد کی مظلومیت کا مظاہرہ کرنے کیلئے اس کا چہرہ جتنا کام دے جاتا ہے، جماعت کو اتنے کام کیلئے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ایک منظم طاقت کو بر سر عام لانا پڑتا ہے۔ پس اجتماعی نظام کے مظالم کے خلاف جماعتوں کے مظاہروں کی نوعیت ایک خاص طرح کی ہے اور ان کا پیمانہ بہت وسیع ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں جبکہ حکومتیں شخصی ہوتی تھیں اور ان پر تنقید کرنے یا ان کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانے یا ان سے کوئی مطالبہ کرنے کیلئے یہ کافی ہوتا تھا کہ آپ کسی طرح دربارِ سلطانی میں پیش ہوتے اور اپنی بات پہنچا دی لیکن آجکل کی حکومتوں کا دربار کسی چار دیواری کے اندر محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ملکوں کی اصل حکمران طاقت رائے عامہ ہوتی ہے اور وزراء اور پارلیمنٹ کے ممبر اسکے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ نمائندے کسی مطالبے، کسی شکایت، کسی احتجاج اور کسی تنقید پر صرف اسی صورت میں توجہ دیتے ہیں جبکہ انہیں محسوس ہو جائے کہ رائے عام کا دباؤ اس کی پشت پر موجود ہے یہی بات عوام کے نمائندوں پر واضح کرنے کیلئے کہ کسی آواز کی پشت پر رائے عامہ کی طاقت موجود ہے مظاہرات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ دورِ حاضر کی حکومتوں کے عوامی طرز پر نشوونما پانے کے ساتھ رائے عام کے مظاہرات ایک طبعی ضرورت کے طور پر ارتقاء پذیر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور آج ان سے صحیح طور پر کام لئے بغیر کوئی تحریک پوری طرح کام نہیں کر سکتی۔

اگر مظاہرات کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو اس کی ماہیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک منظم طاقت نظام تمدن و سیاست کے خداوندوں اور ملک کے عوام کو اپنے احساسات سے آگاہ کرتی ہے وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی نگاہ میں فلاں فلاں کارروائی مضر، غلط اور ظالمانہ ہے اور اس کی روک تھام کی جانی چاہیے، بخلاف اس کے فلاں چیز کرنے کی ہے اور اسے عمل میں لانے کا اہتمام ہونا چاہیے، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مظاہرہ بجائے خود یکسر ایک دعوت اور ایک تبلیغ ہی ہوتا ہے وہ دعوت و تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مظاہرہ غلط کو غلط اور صحیح کو

صحیح کہنے کی ایک عملی اور اجتماعی صورت کا نام ہے وہ منکر کو منکر اور معروف کو معروف کہنے کا ایک وسیع الاثر پیرایہ ہے۔

مظاہرہ صرف حکمران طاقت ہی کو خطاب نہیں کرتا بلکہ وہ رائے عام کی تربیت کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ مظاہرہ عوام ملک کے سامنے ایک مسئلے کو پوری طرح ابھار کر اور وقت کا اہم ترین سوال بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جو اسے جانتا ہو وہ بھی اُس پر سوچنے لگے اور جو اسے نہ جانتا ہو وہ بھی جاننے اور سوچنے پر مجبور ہو جائے، لوگوں میں اس مسئلے پر عام گفتگوؤں کا سلسلہ چھڑ جائے، دو طرفہ دلائل کا چرچا ہونے لگے، اور آہستہ آہستہ عوامی طاقت ایک حق کی حمایت اور اس کے برعکس باطل کی مزاحمت کے لئے یکسو ہو جائے۔

یہی مقصد تھا جس کے تحت حضرت امام مالکؒ نے عین اُس وقت جبکہ ان کو اونٹ پر سوار کر کے اور ان کے چہرے پر سیاہی لیپ کر مدینے کی گلیوں میں گھمایا جا رہا تھا تو اس وقت بآواز بلند عوام سے قدم قدم پر یوں خطاب کیا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور میں کہتا ہوں کہ جبر و اکراہ سے دلائی ہوئی طلاق عند اللہ نافذ العمل نہیں ہوتی۔ آپ یہ کلمات کہتے ہوئے ہمہ تن ایک مظاہرہ تھے، منصور کے غلط نقطۂ نظر اور اس کے ظالمانہ طرزِ عمل کے خلاف، اور اس طرح آپ رائے عام کو درحقیقت دین کی دعوت پہنچا رہے تھے۔

خود نبی صلعم نے جب ایک مرحلے پر آ کر پوری طرح محسوس کر لیا کہ اہل کتاب ہمہ تن فتنہ ہیں اور روشن سے روشن دلائل بھی ان کے ضمیروں کو نہیں جھنجھوڑ سکتے تو آپ نے آخری حربے کے طور پر ان کو مباہلہ کی دعوت دی اور خود اہل بیت سمیت میدان میں آ کر خیمہ زن ہو گئے۔ مباہلے کے طریق کار میں مظاہرے کا ایک پہلو بہر حال موجود تھا اور فریقین کا اختلاف آپؐ کے میدان میں آ کر خیمہ زن ہو جانے سے پوری پبلک کے سامنے اہم ترین مسئلے کی حیثیت سے آ گیا اور اہل کتاب کے فرار نے ان کی اخلاقی کمزوریوں کو اور آنحضور صلعم کی قوتِ یقین کو ساری دنیا کے سامنے واضح کر دیا۔ دلائل سے دعوت دیتے دیتے جب نبی صلعم نے مباہلہ کی یہ صورت اختیار کی ہو گی تو بظاہر یہ ایک انوکھی چیز محسوس ہوئی ہو گی لیکن درحقیقت یہ بھی دعوت ہی کی ایک شکل تھی جس کا روئے سخن اہل کتاب کے ساتھ ساتھ پوری رائے عام کی طرف تھا اور یہ ایک ایسا خطاب تھا جس نے ماحول کے ایک ایک کونے تک حق کی آواز پھیلا دی۔

پس مظاہرہ اگر جائز حدود میں رہے تو اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے دعوت کا ایک وسیع الاثر ذریعہ ہوتا ہے۔ — اور فی نفسہٖ اس میں دینداری کی کوئی نفی نہیں پائی جاتی، الا یہ کہ اس کے لئے پیرایہ اور طریق کار غلط اختیار کیا جائے۔

ایک خدشہ یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے سیاسی طور طریقوں کو اختیار کر لینے سے تعمیرِ سیرت و تقویٰ کا پروگرام کمزور ہو جائیگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ابتک جو سرمایۂ اخلاق و کردار جمع کیا جا چکا ہے وہ بھی نقصان کا شکار ہو جائے۔ پس اگر ان سرگرمیوں کو اختیار کرنا ہی تھا تو ابھی کافی مدت تک سیاسی مصروفیات سے بچ کر داخلی تعمیر کا کام مکمل کر لینا چاہئے تھا۔

اس خدشہ کو سب سے پہلے خود جماعت اسلامی اور اس کے قائم کرنے والوں ہی نے پوری اہمیت کے ساتھ محسوس کیا تھا، اور اسی کے پیشِ نظر جماعت نے سات سال تک جلسوں اور مظاہروں سے اپنا دامن بچا کر پہلے وہ نئی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان وظائفِ سیاسی کو پرانی روایات سے پاک کر کے نئے انداز میں سرانجام دینے کے قابل ہو۔

جماعتِ اسلامی اپنے حلقۂ اثر میں یہ گہرا احساس پہلے سے پیدا کر چکی ہے کہ سیاست کے خارجی اور نمائشی ہنگاموں کو اصل تحریک بنا لینا اور ذہن و سیرت کی تعمیر کے لئے کوئی مخصوص اہتمام نہ کرنا کبھی بھی ایک اسلامی تحریک چلانے اور اس کے نتیجے میں اسلامی نظام قائم کر دکھانے میں کارگر نہیں ہو سکتا۔ ایک جماعت کی اصل قوتِ کار سیاسی مظاہر نہیں، بلکہ اس کی محکم فکر اور اس کے کارکنوں کی مخصوص سیرت ہوتی ہے۔ سیاسی مظاہر صرف ذرائع و وسائل ہیں جن کو وقتی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اختیار کرنا پڑتا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے وجود میں آنے سے قبل تحریکِ مجاہدین سرحد کے بعد کوئی ایسا نظامِ جماعت موجود نہیں تھا جو اسلام کے خطوط پر افکار و کردار کو ارتقاء دینے کے لئے کوئی مخصوص طریق اختیار کرتا، بلکہ اس دوران میں ہماری ساری سیاست محض خارجی مظاہر کے بل پر چلتی رہی ہے، اور خارجی مظاہر سے جذبات میں تو حرکت آتی رہی ہے لیکن شعور کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر کا کوئی سامان نہ ہو سکا، بلکہ اُلٹا سیاست کے جذباتی مظاہر نے مسلمانوں کے اجتماعی سیاسی کردار کو اور زیادہ خانہ خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ جماعت نے ایک مدت تک ان جذباتی مظاہر کے فی نفسہٖ جائز ہونے کے باوجود ان سے اپنے کارکنوں کو پرہیز کرایا ہے، تاکہ کہیں نمائش پسندی اور کھوکھلی ہنگامہ آرائی کی پرانی عادات میں پھر جان نہ پڑ جائے لیکن جب اس پہلو سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ آہستہ بتدریج سیاسی حرکت کے لئے مختلف ذرائع و وسائل کو باندازِ نو استعمال کیا جانے لگا۔

علاوہ بریں سیاست کے خارجی مظاہر ایک عرصۂ دراز سے اسلام کی حدود سے آزاد چلے آ رہے تھے۔ جلسوں میں ہلڑبازی، تقریروں میں جذباتی اشتعال انگیزی، جلوسوں میں فتنہ گردی، نعروں میں دشنام طرازی، پوسٹروں

میں جھوٹا پروپیگنڈہ، ہینڈبلوں میں فتنہ انگیزی، مظاہرات میں بے وقری، ہرتالوں میں جبر و تشدد، ہماری سیاست کا لازمہ بنے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ جماعت نے اس بے اسلام سیاسی ہنگامہ آرائی کے ناپاک مظاہر کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نفرت ماضی کے ردِ عمل کے طور پر بعض اصحاب میں حدِ ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی ہے اور وہ مظاہرِ سیاست کو اسلامی حدود کی پابندی میں محدود ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح مکروہ اور مضر سمجھتے ہیں جس طرح وہ اس سے پہلے تھے۔

ہم نے عندالضرورت ایک حکیمانہ تدریج کے ساتھ ان تمام ذرائع و وسائل سے کام لینا شروع کر دیا ہے جن کے بغیر کوئی تحریک عوامی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ لیکن ان سب کو پرانی ناپاک روایات سے پاک کر کے اسلامی اصولوں کے خراد پر گھما کر از سرِ نو ان کی نوک پلک بنائی ہے، اور مظاہرِ سیاسی کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔ ٹھوس علمی لٹریچر کے ساتھ ہم اب پوسٹروں اور ہینڈبلوں سے بھی کام لیتے ہیں، اپنے مخصوص اجتماعات کے ساتھ ساتھ ہم اب جلسہ ہائے عام بھی کرتے ہیں، اصولِ دین کی دعوت کے ساتھ ہم حکومت کی اصلاح کے لئے مطالبے اور ریزولیوشن بھی سامنے لاتے ہیں، اور زبان و قلم سے اظہارِ جذبات کے پہلو بہ پہلو مظاہرات سے بھی کام لیتے ہیں ——— اور آگے چل کے ہمیں دوسرے مختلف جائز طریقے بھی ذرائع و وسائل کی حیثیت سے اختیار کرنے ہوں گے۔

لیکن ہم نے سیاست کے ذرائع و وسائل کو اسلامی حدود کا پابند بنا کر اتنا بدل دیا ہے، کہ ہمارے پوسٹر ہمارے جلسے، ہمارے بیانات، ہمارے ریزولیوشن، ہمارے مطالبے اور ہمارے مظاہرے خود تعمیرِ فکر و سیرت کے نہایت موثر ذرائع بن گئے ہیں۔ وہ سیاست جو خالص دینوی خطوط پر چلتی رہی ہے، اس کے مظاہر یقیناً سیرت و اخلاق کے لئے تباہ کن تھے، لیکن اب جبکہ سیاست کو دین کی شاہراہ پر ڈال دیا گیا ہے، اب یہ مظاہر خود تعمیرِ سیرت و اخلاق کے بہترین ذرائع ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری تمام سیاسی سرگرمیاں جماعت کے کارکنوں کے لئے بھی اور عوام الناس کے لئے بھی سنجیدگی، وقار، پابندیٔ وقت، احترامِ نظم اور اہتمامِ اخلاق کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایک قابلِ قدر سامان بنتی جا رہی ہیں[۱]۔ اللہ کی اس عنایت پر ہم اُس کے حد درجہ شکر گذار ہیں۔

---

[۱] جماعت اسلامی کے جلسوں کی مخصوص نوعیت سے پورا ملک پہلے ہی متاثر تھا۔ لیکن بحمداللہ جماعت کے خاموش احتجاجی مظاہرے نے ہر مقام پر پہلے سے بھی زیادہ اچھا اثر ڈالا ہے۔ اور عام شہریوں کے علاوہ بعض سرکاری افسر اور پریس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ دنیا پرستانہ سیاست جس سے کنارہ کش ہوئے بغیر سیرت و تقویٰ کی تعمیر ممکن نہیں اس کے ناپاک مظاہر سے جیسی نفرت ہمیں کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے، لیکن سیاست کے اسلامی حدود میں پابند ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ اس کے معتدل اور متوازن مظاہر کو تقویٰ کے منافی اور سیرت کے لئے مہلک سمجھتے ہوں، اُن کے دل و دماغ میں یقیناً دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ ابتک پناہ گزیں ہے۔ حالانکہ وہ سیاست جس کا محور نظامِ اسلامی کے قیام کا نصب العین ہو اور جس کے طریق کار کا ہر پہلو اسلامی حدودِ اخلاق کا پابند ہو، وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے ——— اور تمام نفل عبادات سے افضل عبادت ہے۔ یہ افضل ترین عبادت صرف ایسے لوگوں کے تقویٰ کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔ جو سیاست کی ذمہ داریوں کو دین سے الگ سمجھتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے نزدیک سیاست کی ساری خدمات خود دین ہیں، وہ تو نظامِ اسلامی کے قیام کی جدوجہد میں جو قدم بھی اٹھاتے ہیں وہی ان کے لئے تعمیرِ تقویٰ کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت کے اکثر کارکنوں کا حال یہی ہے کہ وہ جب تانگے پر بیٹھے کوئی اعلان کر رہے ہوتے ہیں، کسی ہینڈبل کو تقسیم کرتے ہیں، کسی جلسے کے لئے دریاں بچھا رہے ہوتے ہیں، دیواروں پر کوئی پوسٹر چپاں کر رہے ہوتے ہیں، کسی اجتماع میں شرکت کے لئے معروفِ سفر ہوتے ہیں، اور اسی طرح جب وہ کسی مظاہرے میں کتبات لئے چوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ان ساری ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آقا کی اطاعت و عبادت کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت صرف اُن قلوب کے لئے حرام کر دی جاتی ہے۔ جو اسلامی سیاست کو بھی دین سے الگ کوئی چیز شمار کرتے ہیں۔

پھر یہ امر بجائے خود قابلِ غور ہے کہ زندگی کی جنگاہ سے الگ بیٹھ کر تعمیرِ سیرت کرنے کے لئے میدانِ کار ہے کہاں؟ جسے پیراک بننا ہو، اسے بہر حال پانی کی موجوں کے اندر ہی پیرنا سیکھنا ہوگا۔ پانی سے باہر پیرنے کی کوئی تربیت گاہ اس آسمان کے نیچے کہیں موجود نہیں ہے۔ اخلاق و تقویٰ پیدا کرنے کے لئے روحانی کسرت کا کوئی مقررہ کورس نہیں ہے کہ ہنگامہ ہائے حیات سے الگ رہ کر پہلے اسے پورا کر لیا جائے اور پھر سندِ فراغت ملنے کے بعد اپنے آپ کو مختلف ذمہ داریوں میں معروف کیا جائے۔ اخلاق و تقویٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کارکن بھی اس سے خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ رفقائے جماعت کی طرف مسلسل حوصلہ افزا رپورٹیں موصول ہو رہی ہیں۔

تو زندگی میں کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جس حد تک عملی سرگرمیوں میں حصہ لیا جا رہا ہو۔ خلوت میں رہیے تو خلوت ہی کا تقویٰ پیدا ہوگا، جلوت کا تقویٰ خلوت میں نہیں آسکتا، اس کے لئے تو جلوت میں ہی آنا پڑیگا۔ کاروبار کا تقویٰ صرف کاروبار کرنے کے دوران میں پیدا کیا جا سکتا ہے، مسجد میں نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ میدانِ جنگ کا تقویٰ تیغ و تفنگ کے ہنگامے میں کود پڑنے والوں ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، سبکسارانِ ساحل کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ بالکل اسی طرح سیاسیات کا تقویٰ — جو عام انفرادی سرگرمیوں کے تقویٰ سے بہت ہی بلند مرتبہ ہے — سیاسیات سے دامن بچا کر پیدا کرنا ناممکن ہے، اسے جب بھی آپ پیدا کرنا چاہیں گے تو آپ کو لازماً میدانِ سیاست میں قدم رکھنا ہوگا۔ رضائے الٰہی کو اپنا مقصود بنا کر آپ حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے جس سرگرمی میں بھی حصہ لیں گے وہ عین عبادت بن جائے گی اور آپ کے اندر اخلاق و تقویٰ کی تعمیر کا وسیلہ ثابت ہوگی۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو پھر آپ کو خود اپنی ہر حرکت پر محسوس ہوگا کہ یہ تو "دنیویت" ہے اور یہ تو ذہن و سیرت کے لئے تباہ کن ہے۔ اور اس طرح آپ آخر کار مجبور ہو جائیں گے کہ کسی خانقاہ میں جا کے پناہ لیں، اور پھر پڑے رہیں "تصوّرِ جاناں لئے ہوئے"۔

بلاشبہ آپ کو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے جو کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان میں دنیائے تصوف کا یہ "تصوّرِ جاناں" آپ کو نہیں ملے گا، بلکہ آپ جب بھی ادھر بڑھیں گے تو وہ غلط قسم کا تصوّرِ جاناں کہیں فضا میں کھو جائے گا اور آپ اس کے پیچھے ہاتھ پھیلائے ٹامک ٹوئیے مارتے پھریں گے، لیکن اُس کا سراغ نہ ملے گا۔ بخلاف اس عالمِ خواب کے سے تصورِ جاناں کے ہماری سرگرمیوں میں آپ کو عالمِ بیداری کا ایک نیا تصوّرِ جاناں محسوس ہوگا، بشرطیکہ آپ دین و سیاست کی تفریق کے "حجابِ اکبر" کو چاک کر کے آگے بڑھیں۔

یہ بلاشبہ درست ہے کہ ایک جماعت کو عوامی دور سے قبل ایک دورِ ابتدائی تیاری اور تعارف کا عبور کرنا پڑتا ہے جس میں وہ سیاست میں براہ راست مداخلت کرنے کے بجائے بالواسطہ طور پر اثر ڈالتی ہے اور عملی انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنے کی خاطر سے ایک فکری انقلاب برپا کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ لیکن یہ سوال کہ اسے کب تک فکری انقلاب ہی پر اپنی توجہ مرتکز رکھنی چاہیے اور عوامی دور میں قدم

(بقیہ بر صفحہ ۴۸)

سلسلہ مباحث

اسلامی ریاست

غیر مسلموں کے حقوق

(قسط دوم)

مولانا امین احسن اصلاحی

ذمیوں یعنی اہل العنوہ کے حقوق

اب میں ذمیوں[1] کے شرعی (اسلامی حکومت کے اندر ان کے دستوری) حقوق سے بحث کروں گا۔ لیکن ان حقوق کی اصل قدر و قیمت اور ان کی صحیح سپرٹ اور اہمیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ حسب ذیل چار باتیں پیش نظر رکھی جائیں:۔

(۱) یہ حقوق اسلام میں اُن لوگوں کے ہیں جن کو ہمارے اہل فقہ اپنی اصطلاح میں اہل عنوہ کہتے ہیں یعنی جنہوں نے خدا اور اس کے رسول سے جنگ کی اور پھر "اسلام" کی تلوار سے شکست کھا کر اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے پر مجبور ہوئے[2]۔

[1] جیسا کہ ابتدا میں بھی یہ بات واضح کی جا چکی ہے اس مضمون میں "ذمیوں" سے مراد غیر مسلم رعایا کا یہی گروہ لیا گیا ہے۔

[2] "مسلمانوں کی حکومت" اور "اسلامی حکومت" کے فرق، اور "خدا اور رسول کو اپنے معاملات میں آخری سند نہ ماننے والی کسی مسلمان قوم کی اپنی دنیوی منفعتوں کے لئے جنگ" اور "اسلامی جہاد" کے فرق کو نمایاں طور پر ذہن میں موجود رہنا چاہئے، کیونکہ مسلمانوں کی وہ حکومت جو اسلام پر قائم نہ ہو اور مسلمان قوم جو اپنے معاملات میں خدا اور رسول کے سوا کسی اور سے سند لیتی ہو، یہاں اس کے معاملات زیر بحث نہیں ہیں۔

(۲) جو حقوق یہاں بیان کئے جا رہے ہیں ان کی حیثیت دنیا کے عام دستوری تحفظات کی سی نہیں ہے[1] بلکہ یہ سارے حقوق اسلامی شریعت کے اسی طرح اجزاء (Part and Parcel) ہیں جس طرح خدا اور رسول کے عائد کردہ دوسرے فرائض اور واجبات - اس لئے ان کا بہر شکل اور بہر حال قائم رکھنا اسلامی حکومت کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام و واجبات کا - اگر ان میں سے کسی حق کو بھی، بغیر کسی واقعی عذر کے، ضائع کیا گیا تو اسلامی ریاست صرف اس زمین ہی پر اس کے لئے جواب دہ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد اس کی اصل جوابدہی خدا کے سامنے ہے اور وہاں اس مقدمہ میں مظلوم اہل ذمہ کے وکیل، جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے، خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔

(۳) ذمیوں کو یہ حقوق مسلمانوں یا ان کی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اور ان کی ضمانت پر دیئے جاتے ہیں، ان کی ادائیگی میں دانستہ اور بلا عذر کوتاہی خدا اور رسول سے خیانت، اور غداری ہوگی۔

(۴) ذمیوں کے یہ حقوق کم سے کم ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے عطا کئے جانے کی وجہ سے ان میں ذرا سی کمی کرنے کا بھی کسی اسلامی حکومت کو حق نہیں ہے - ان سے زیادہ وہ جو چاہے دے مگر ان میں سے کوئی حق کم کرنے کی وہ مجاز نہیں ہے۔

جو لوگ اسلامی حکومت کے اندر عام اہل ذمہ اور معاہد غیر مسلم رعایا کی الگ الگ قانونی حیثیت اور ان کے حقوق کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھتے اور مذکورہ بالا باتوں کو بھی ان کی صحیح سپرٹ اور پوری وسعت کے ساتھ پیش نظر نہیں رکھتے وہ جب قرآن مجید میں یہ پڑھتے ہیں: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (وہ عاجزانہ حاضر ہو کر جزیہ ادا کریں)، یا وہ حدیثیں ان کی نظر سے

---

[1] کیونکہ ایسے تحفظات میں سے اکثر کی اول تو کتاب دستور کی زینت ہونے سے زیادہ کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک اور اسی حد تک جب تک اور جس حد تک حکومت کی حکمت عملی اور اغراض کے لئے ضروری یا مفید ہو۔

گذرتی ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے فاتحین کے بالمقابل اپنے مفتوحین کی مفتوحیت کو نمایاں رکھنا چاہا ہے۔ تو وہ ان باتوں سے غیر مسلموں کے آگے ایک شرمندگی سی محسوس کرتے ہیں اور پھر جب یہی احساس شرمندگی لئے ہوئے اِن مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں تو یا تو مسئلہ کے ضروری پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یا پھر ان کی ایسی فضول قسم کی تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے غیر مسلموں کے شبہات تو کیا دور ہوں گے الٹے عام مسلمان بھی شکوک اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر غیر مسلم رعایا کے اِن دونوں گروہوں اور ان کے سیاسی مرتبہ کے قانونی اور بنیادی فرق اور پھر ذمیوں کے حقوق کی مذکورہ نوعیت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس شرمندگی کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسلام نے اپنے مفتوحین کو جو حقوق دیئے ہیں اور جن ضمانتوں کے ساتھ دیئے ہیں اور پھر اسلام کے پابند مسلمانوں نے جس سپرٹ اور جس دیانت و امانت کے ساتھ ان کو ادا کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی چہ جائیکہ اس پر کوئی اعتراض کیا جا سکے۔ یہاں سوال کاغذی اور کتابی حقوق کا نہیں ہے بلکہ سوال ان حقوق کا ہے جو مفتوح دشمن کو فی الواقع دیئے گئے ہیں، اور صرف کاغذ کے صفحات پر نہیں بلکہ صفحۂ ارض پر دیئے گئے ہیں۔

اس مختصر تمہیدی تشریح کے بعد، اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ، ان کم سے کم حقوق اور فرائض کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو اسلامی شریعت نے ذمیوں کو دیئے ہیں یا ان پر عاید کئے ہیں۔

زمین اور خراج ذمی اپنی زمینوں کے مالک تو نہیں رہیں گے لیکن انہیں انکی زمینوں سے بیدخل بھی نہیں کیا جائیگا

ا؎ اس معاملہ کا فیصلہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہو گیا کہ مفتوحین کی زمینیں فاتحین میں تقسیم نہیں کی جائیں گی بلکہ وہ بدستور مفتوحین کے قبضہ میں رہیں گی اور حکومت ان سے خراج وصول کرے گی۔ جب کچھ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مفتوحین کی زمینیں مال غنیمت کی طرح تقسیم کی جائیں تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: انّھا عین المال (زمین کی حیثیت مستقل جائداد، Real Property - کی ہے)۔ یہ فوج میں تقسیم نہیں ہو گی۔ دشمن سے حاصل شدہ چیزوں میں سے صرف وہ چیزیں فوج میں تقسیم ہوں گی جو ذاتی املاک (Personal i.e movable property) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اپنی جگہ پر آئیگی۔

اس قبضہ کی نوعیت موروثی (Hereditary) ہوگی یعنی یہ قبضہ نسلاً بعد نسل ان کے ورثاء کو منتقل ہوگا۔ اس زمین سے متعلق "آپس میں" وہ بیع، رہن اور ہبہ کے معاملات بھی کرسکیں گے[1]۔ اور حکومت ان زمینوں سے اپنے حقوق مالکانہ ایک مناسب شرح خراج کی صورت میں وصول کرے گی۔

خراج کی تشخیص میں اس امر کا لحاظ رکھا جائیگا کہ تشخیص کردہ خراج کا بار زمین آسانی سے اٹھا سکے۔ اور کسانوں کی واقعی ضروریات سے جو رقم فاضل بچے خراج کی زد صرف اس پر پڑے (انما امرنا ان ناخذ عنهم العفو)۔ عراق کی زمینوں کی پیمائش اور ان کے خراج کی تشخیص کے لئے حضرت عمرؓ نے جن لوگوں کو متعین کیا تھا جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر واپس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے اس امر کی پوری تحقیق کی کہ "اتنا خراج تو نہیں لگا دیا ہے۔ کہ زمین اس کا تحمل ہی نہ کرسکے؟" جب ان لوگوں نے اطمینان دلایا اور تحقیق سے یقین ہوگیا کہ زمین کی پیداوار میں ذمیوں کے لئے کافی گنجائش چھوڑی گئی ہے[2]۔ اور تشخیص میں کسانوں کی واقعی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تو حضرت عمر کو اطمینان ہوا۔ اور انہوں نے اس تشخیص کی منظوری دی۔

نیز یہ خراج صرف اُن زرعی اور زیر کاشت زمینوں پر ہی لگایا جاتا ہے۔ جن سے کسان کو آمدنی ہوتی ہو۔ ذمیوں کے مکانات اور ان کے رہائشی مصرف کی دوسری زمینیں خراج سے مستثنیٰ ہیں[3]۔ خراج کی وصولی میں ذمیوں کے پہننے کے کپڑے، گھر کے برتن، خوراک کی مد کا غلہ، ہل، بیل اور دوسرے آلات کشاورزی نہ قبضہ میں لئے جاسکتے ہیں اور نہ قرق کئے جاسکتے[4]۔

حضرت علیؓ نے ایک شخص کو عکبری کا تحصیلدار مقرر کیا۔ ذمیوں کے روبرو تو اس کو یہ ہدایت فرمائی کہ دیکھو، جزیہ و خراج کی وصولی میں ان لوگوں سے ایک پیسہ بھی رعایت نہ کرنا۔ لیکن تنہائی میں

---

[1] کتاب الاموال ابو عبید۔ صفحہ ۸۴

[2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف - صفحہ ۲۱

[3] کتاب الاموال ابو عبید - صفحہ ۴۲

[4] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف، صفحہ ۹

بلا کر اس سے کہا کہ لوگوں کے سامنے میں نے جو بات کہی ہے وہ تو تم نے سن لی، اب ایک بات اور کہتا ہوں اور یاد رکھو، اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو معزول کر دوں گا۔ وہ یہ کہ خراج وصول کرنے کے لئے نہ کسی کا گدھا بیچنا، نہ اس کا بیل اور نہ اس کے سردی اور گرمی کے کپڑے۔ ان کے ساتھ نرمی کرنا، پھر نرمی کرنا، پھر نرمی کرنا۔[1]

خراج وصول کرنے کے لئے نہ کسی کو کوڑے مارے جائیں گے، نہ اس کو کھڑا رکھا جائے گا اور نہ اس کا ضروری سامان قرق کیا جائیگا۔[2] اس میں زیادہ سے زیادہ مہلت جو دینی ممکن ہے۔ وہ ان کو دی جائیگی۔

سعید بن عامر شام میں کسی مقام کے تحصیلدار تھے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ ان پر برہم ہوئے کہ خراج کی وصولی میں دیر کیوں ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے حکم دیا ہے کہ کسانوں سے (ایک وقت میں) چار چار دینار سے زیادہ نہ وصول کیا جائے۔ ہم یہ تو کرتے ہی ہیں۔ لیکن اتنا مزید کرتے ہیں کہ فصل کی تیاری تک ان کو مہلت دے دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان کا یہ جواب سنکر اس قدر خوش ہوئے کہ فرمایا، جب تک میں زندہ ہوں تم کو اس منصب سے معزول نہیں کرونگا۔[3] رعایا کو ظلم سے محفوظ رکھنے کے لئے حضرت عمرؓ یہ بھی کرتے تھے کہ جب عراق کا خراج آتا تو کوفہ اور بصرہ کے ذمہ دار لوگوں کو بلا کر ان سے قسمیں لیتے کہ اس مال کا کوئی حصہ کسی غیر مسلم پر زیادتی کر کے تو نہیں حاصل کیا گیا ہے؟[4]

یہی نہیں بلکہ جو لوگ خراج کی تحصیل پر مقرر کئے جاتے، خوب اچھی طرح جانچ کر مقرر کئے جاتے۔ حضرت عمرؓ کو اس کام کے لئے آدمیوں کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے کوفہ، بصرہ اور شام کے لوگوں کو لکھا کہ اپنے اندر سے بہترین آدمیوں کے نام منتخب کر کے لکھو۔ لوگوں نے نام منتخب کر کے

---

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۴

[2] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۲۰

[3] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۴

[4] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۶۵

بھیجے تو آپ نے ان لوگوں کو خراج کی وصولی پر مقرر کیا[1]۔

قاضی ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے تحصیلداروں کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے[2]:-

ایک یہ کہ وہ ذی علم اور فقیہ (قانون داں) ہوں۔

دوسرے یہ کہ وہ اہل الرائے سے مشورہ لے کر کام کرنے کے عادی ہوں، مطلق العنانی اور خودرائی کا رجحان نہ رکھتے ہوں۔

تیسرے یہ کہ دیانت دار ہوں۔ ان کی کوئی بددیانتی ظاہر نہ ہوئی ہو۔

چوتھے یہ کہ وہ کسی حق کی حفاظت اور کسی امانت کی ادائیگی میں خدا کے سوا اور کسی کی پرواہ کرنے والے نہ ہوں۔

اہل ذمہ کو ظلم و ناانصافی سے بچانے کے لئے حکومت خراج کی تحصیل کا انتظام براہ راست کرے گی یہ کام بیچ کے آدمیوں (نمبرداروں، انعام داروں، جاگیرداروں) سے ٹھیکہ پر نہیں لے گی۔ اور اگر خود اہل ذمہ کی خواہش پر بھی ایسا کرنے کی نوبت آئے گی تو حکومت کی طرف سے اس بات کی پوری نگرانی کی جائے گی کہ بیچ کے آدمیوں (middle-men) کو رعایا پر ظلم کرنے اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے[3]۔

جزیہ ذمیوں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جائیگا۔ جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جائے گا۔ جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنے ہیں۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین اور غریب اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی مستثنے ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنے کیا گیا ہے[4]۔ یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ

---

[1] کتاب الخراج، قاضی ابویوسف۔ صفحہ ۶۲

[2] 〃 〃 〃 ۶۰

[3] 〃 〃 〃 ۶۰ [4] کتاب الخراج، قاضی ابویوسف، صفحہ ۷۰

سے لگایا جائیگا۔ لیکن چونکہ اصول یہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ "لیس فی اموال اھل الذمہ الا العفو"[1] یعنی اہل ذمہ کے مال میں حکومت کا حق وہی ہے جو ان کی ضروریات سے فاضل ہو، اس وجہ سے یہ ٹیکس ہمیشہ نہایت ہلکا لگایا گیا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں امیروں سے ایک روپیہ ماہوار، متوسطین سے آٹھ آنے ماہوار اور غربا سے چار آنے ماہوار کے حساب سے وصول کیا گیا ہے[2]۔ اور اس پر بھی اگر کسی شخص کے بارہ میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ یہ رقم اس کے لئے زیادہ ہے تو اس میں بھی کمی کر دی گئی ہے[3]۔

جزیہ کی وصولی کے لئے کسی شخص پر کوئی ناروا سختی یا جبر و ظلم نہیں کیا جائے گا۔ نہ اس کو دھوپ میں کھڑا کیا جائے گا، نہ کوئی اور جسمانی ایذا دی جائے گی بلکہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے گی[4]۔ حضرت عمرؓ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ کا مال زیادہ آگیا تو آپ نے تحصیلداروں سے فرمایا، میرا خیال ہے۔ کہ تم لوگوں نے خوب رعایا کو تباہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم نے بڑی نرمی اور درگذر کے ساتھ وصولی کی ہے۔ پوچھا، بغیر مارے باندھے؟ تحصیلداروں نے جواب دیا، ہاں اے امیر المؤمنین بغیر مارے باندھے۔ پورا اطمینان کرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ نہ میرے اپنے ہاتھوں اس طرح کا کوئی ظلم ہوتا ہے۔ اور نہ میری سلطنت میں کوئی ظلم ہوتا ہے[5]۔

لوگوں کی آسانی کے لئے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں، اہل صنعت سے جزیہ میں وہی چیزیں قبول کر لی گئی ہیں جو وہ تیار کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سوئیاں تیار کرنے والوں سے سوئیاں، کنگھیاں بنانے والوں سے کنگھیاں، رسیاں بٹنے والوں سے رسیاں ہی جزیہ میں قبول کر لیتے تھے تاکہ لوگوں کو آسانی

---

[1] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۷۰

[2] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۰

[3] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۱

[4] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۷۰

[5] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۳

میں کوئی زحمت نہ ہو۔[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص مرگیا یا بھاگ گیا تو اس کے ذمہ جزیہ کی جو رقم واجب الادا تھی، وہ اس کے وارثوں سے نہیں وصول کی جائے گی۔[2]

جزیہ چونکہ حفاظت جان و مال کا ٹیکس ہے۔ اس وجہ سے جب کبھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمان یہ ذمہ داری لینے کے بعد اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں تو انہوں نے جزیہ واپس کر دیا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ کی گورنری کے زمانہ میں شام کے بعض مقامات پر رومیوں کی ایسی یورش ہوئی کہ مسلمانوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ حضرت ابو عبیدہ نے ذمیوں کا جزیہ واپس کر دیا۔ اس پر ذمیوں نے دعا کی کہ خدا تم کو رومیوں پر غالب کرے اور پھر واپس لائے۔ اگر رومی تمہاری حیثیت میں ہوتے تو کوئی چیز واپس کرنا تو الگ رہا، جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ بھی لوٹ کے لے جاتے۔[3]

ذمی چونکہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اس وجہ سے اگر ذمیوں نے اپنی مرضی سے کوئی فوجی خدمت انجام دی ہے یا ان سے کوئی فوجی خدمت لی گئی ہے تو اس دوران میں وہ جزیہ سے مستثنیٰ رکھے گئے ہیں۔ نیز اگر کسی ذمی نے اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت سے ریاست کو کوئی نمایاں فائدہ پہنچایا ہے تو وہ جزیہ سے مستقلاً بری کر دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں قاہرہ سے بحر احمر تک جو نہر نکالی گئی اس کے نقشہ کی تیاری میں جس ذمی نے مدد دی تھی اس کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔[4]

اہل ذمہ کا حق بیت المال میں

جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہو جائیں گے۔ ان کے لئے ان کی ضرورت کے موافق اسلامی بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن

---

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۵

[2] " " " ۴۹

[3] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۸۱

[4] ان دونوں باتوں کا ذکر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب دی مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ کے صفحہ ۱۰۱ پر کیا ہے اور طبری اور سیوطی کی حسن المحاضرہ کا حوالہ دیا ہے۔

عبدالعزیز نے اپنے عامل عدی بن ارطات کو حکم بھیجا کہ "تمہارے حلقہ میں جو اہل ذمہ ہیں ان کے حالات معلوم کرو، جو بوڑھے ہو چکے ہوں اور کمانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں ان کے لئے ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفے جاری کردو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ امیرالمومنین عمر فاروق نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو دروازہ دروازہ بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا، اگر جوانی میں تم سے جزیہ وصول کیا اور بڑھاپے میں تمہیں نظر انداز کردیا۔ اس کے بعد آپ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کردیا"۔[۱]

اہل حیرہ کے لئے حضرت خالدؓ نے یہ ذمہ لیا تھا کہ تم میں سے جو بوڑھا ہو جائیگا یا جس پر کوئی آفت آجائے گی یا جو شخص مالدار رہنے کے بعد غریب ہو جائے گا، وہ جب تک دارالاسلام میں رہے گا اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا۔[۲]

اگر کوئی ذمی دشمن کے قبضہ میں آجائے اور اس کو فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فدیہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔[۳]

اہل ذمہ کی جان کی حفاظت چونکہ جزیہ کے بدلہ میں اسلامی حکومت اہل ذمہ کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے[۴]۔ اس وجہ سے جس طرح وہ ایک مسلمان کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے اسی طرح ایک ذمی کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی طرح قانون کی نظر میں ایک مسلم اور ایک ذمی کی جان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شعبی، نخعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلم قتل کیا جائے گا۔[۵] طبرانی نے روایت کی ہے۔ کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک

---

[۱] کتاب الاموال، ابوعبید، صفحہ ۴۶

[۲] کتاب الخراج، قاضی ابویوسف، صفحہ ۸۵

[۳] کتاب الاموال، ابوعبید، صفحہ ۱۲۷

[۴] لان دماءھم و اموالھم انما احرزت باداء الجزیۃ (اسلئے کہ جزیہ ادا کرنے کے بعد ان کے جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں)۔ کتاب الخراج، قاضی ابویوسف۔ صفحہ ۷۰۔

[۵] نیل الاوطار۔ جلد ۷، صفحہ ۸

مسلمان لایا گیا۔ جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تھا۔ تحقیق سے اس پر الزام ثابت ہو گیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ بعد میں مقتول کے بھائی نے آکر کہا کہ میں نے قاتل کو معاف کر دیا حضرت علی نے فرمایا، شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے! اس نے کہا، امیر المومنین، یہ بات نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل کے قتل ہونے سے میرا بھائی تو ملنے سے رہا اور ان لوگوں نے مجھے کچھ پیشکش کی ہے جو میں نے قبول کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا اس بات کا تم کو اختیار ہے، ورنہ ہم نے جن لوگوں کا ذمہ لیا ہے۔ ان کا خون ہمارے خون کے برابر ہے۔ اور ان کی دیت (خوں بہا) ہماری دیت کے برابر ہے

احادیث میں ذمی کے قتل کے بارہ میں بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں:۔

"عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی (مسافت کی) دوری سے محسوس ہو گی۔" (احمد، بخاری، النسائی، ابن ماجہ)۔

"ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی ذمی کو، جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے، قتل کیا اُس نے اللہ کے ذمہ کو توڑا اور وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے سونگھی جاتی ہے گی۔" (ابن ماجہ، ترمذی)

اسی طرح ذمی کی دیت کے بارہ میں امام ثوری، امام زہری، زید بن علی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک ذمی کے خون بہا میں بصورت قتل عمد کوئی فرق نہیں ہے۔

عمرو بن امیہ ضمری نے دو عامریوں کو، جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد تھا، نادانستہ طور پر قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہی دیت دلوائی جو مسلمانوں کی دیت تھی۔

بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمانوں کی دیت کے برابر تھی اور یہی صورت حال حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت

عثمان کے زمانوں میں رہی۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذمی کی دیت وہی ادا کی جو ایک مسلمان کی دیت ہوتی ہے[۱]۔

اس انفرادی حفاظت کے علاوہ اگر کوئی دشمن اہل ذمہ پر حملہ آور ہوگا تو اسلامی حکومت ان کی حفاظت کے لئے جنگ کرے گی۔ (وان یقاتل من ورائھم[۲]۔ اور یہ کہ ان کی حفاظت کے لئے جنگ کی جائے گی۔)

اہل ذمہ کے مال کا احترام اہل ذمہ کی جان کی طرح ان کا مال بھی اسلامی حکومت میں محترم (*Inviolable*) ہے۔

"صعصعہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ جب اہل ذمہ کی بستیوں سے گذرتے ہیں تو اُن کی چیزوں میں سے کبھی کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا، بلا قیمت؟ میں نے عرض کیا، ہاں، بلا قیمت۔ ابن عباس نے فرمایا، آخر تم لوگ اس بارہ میں کہتے کیا ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (یعنی معمولی بات ہے)۔ انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ وہی بات کہتے ہو جو اہل کتاب کہتے ہیں کہ لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون۔ (ہمارے لئے اُمیوں۔ غیر اہل کتاب۔ کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور وہ اللہ پر جان بوجھ کر بہتان لگاتے ہیں)[۳]"

"ابو عبداللہ یا ابو عبدالرحمن راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں سعد کے ساتھ تھا۔ رات راستہ میں گذارنی پڑی۔ پاس ایک ذمی کا مکان تھا۔ ہم نے اس کے مالک کو دریافت کیا لیکن وہ

---

[۱] یہ ساری تفصیل نیل الاوطار باب دیۃ المعاہد، جلد ۷، صفحہ ۵۵ سے لی گئی ہے۔

[۲] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۲۱

[۳] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۴۹۔

گھر پر موجود نہ تھا۔ سعد نے کہا، اگر کل کو خدا سے ایمان کے ساتھ ملنے کی آرزو رکھتے ہو۔ تو خبردار اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ چنانچہ ہم نے اس کی دیوار کے نیچے بھوکے رات گذار دی [۱]"

حضرت ابوالدرداؓ کا حال یہ تھا کہ اگر اہل ذمہ کی کسی بستی سے ان کا گذر ہوتا تو زیادہ سے زیادہ جو فائدہ وہ ان سے اٹھاتے وہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے کنویں سے پانی پی لیں، ان کے سایہ میں سستا لیں اور ان کی چراگاہ میں اپنے گھوڑے کو چرالیں اور پھر اس کا بھی نقد یا جنس کی صورت میں ان کو معاوضہ دیتے [۲]

عُبادہ بن صامتؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے ذمیوں کی کسی بستی میں اپنے غلام کو مسواک کے لئے بھیجا لیکن پھر واپس بلا لیا اور کہا جانے دو، آج اس کی کوئی قیمت نہ سہی لیکن کل خشک ہو کر اس کی بھی قیمت ہو گی [۳]

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے۔ ایک ذمی نے آکر ان کو خبر دی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر ڈالا۔ حضرت عمرؓ خود تحقیق کے لئے بڑھے۔ دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لئے چلے جا رہے ہیں۔ فرمایا، اچھا، آپ بھی ہیں! انہوں نے جواب دیا، امیر المؤمنین، بھوک نے ستایا تھا اس وجہ سے یہ حرکت ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے فوراً حکم دیا کہ باغ والے کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے [۴]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فوج کی زیادتیوں سے اہل ذمہ کے سامنے اپنی برأت کا اظہار کیا [۵]۔

چونکہ عموماً اہل ذمہ کی بستیاں دارالاسلام کے شہروں سے دور واقع تھیں اور ان میں

---

[۱] کتاب الاموال، ابوعبید، صفحہ ۱۵۰

[۲] " " " ۱۵۰

[۳] " " " ۱۵۰

[۴] " " " ۱۵۱

[۵] " " " ۱۵۱

مسلمان آباد نہیں تھے اور نہ ابھی اُس زمانہ میں حالات نے اتنی ترقی کی تھی کہ سرکاری عمال اور دوسرے مسلمانوں کے ٹھیرنے کے لئے اُن علاقوں میں سرکاری طور پر کوئی انتظام ہو سکے اس وجہ سے اکثر مقامات کے ذمیوں سے یہ قرارداد ہو گئی تھی کہ جو مسلمان ان کی بستیوں میں آئیں گے چوبیس گھنٹے کے لئے ان کی میزبانی کا بار اہل ذمہ اٹھائیں گے۔ اگر بارش یا بیماری کی وجہ سے کسی کو اس سے زیادہ ٹھیرنا پڑے گا۔ تو وہ اپنے مصارف پر ٹھیرے گا۔ اور اس میزبانی کے سلسلہ میں پیٹ بھر روٹی اور اپنے مرکب کے چارہ کے سوا کسی اور شے کے مطالبہ کا حق کسی کو نہ ہوگا۔

إنا جعلنا الضيافة على أهل السواد يوماً وليلة وإن حبسه مطر أو مرض انفق من ماله ولا يتوزى من طعام أو علف۔

ہم نے اہل عراق پر صرف ایک دن رات کی ضیافت لازم قرار دی ہے۔ اور اس میں کھانے اور چارہ سے زیادہ کچھ لینے کا حق نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو بارش یا بیماری کی وجہ سے زیادہ دن رکنا پڑے تو وہ اپنے پاس سے خرچ کرے۔

اگرچہ کسی پہلو سے اس چیز کو ناجائز یا اہل ذمہ پر کوئی زیادتی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن اس بارہ میں بھی امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ان سے کوئی چیز ان کی مرضی کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔ پوچھا گیا، پھر یہ جو ان کے اوپر مسلمانوں کی میزبانی کا بار ڈالا گیا، یہ کیا تھا؟ فرمایا اس کے بدلہ میں ان کے جزیہ میں کمی کی جاتی تھی۔ امام صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

لا ينال منهم شيئ إلا بطيب انفسهم۔ قيل فالضيافة التي كانت عليهم؟ فقال كان يخفف عنهم لها[1]۔

اہل ذمہ کے مذہبی حقوق اہل ذمہ اپنے مذہبی فرائض و مراسم بجا لانے میں بالکل آزاد ہوں گے اس بارہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جن شہروں میں ان کے فتح ہونے کے بعد حکومت نے ذمیوں کے قیام کو منظور کر لیا ہے ان شہروں میں ان کے مذہبی حقوق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائیگی۔

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۴۹

ابو عبید نے بزور شمشیر فتح کئے ہوئے مقامات کی ایک لمبی فہرست دینے کے بعد لکھا ہے،

فھذا بلاد العنوۃ و قد اقر اھلھا فیھا علی مللھم و شرائعھم[1]۔

یہ سارے مقامات بزور شمشیر فتح ہوئے ہیں اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب و شریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی۔

اس آزادی پر اگر کوئی پابندی ہے تو صرف ان شہروں میں ہے جن کو خاص طور پر مسلمانوں نے بسایا ہو یا جن کو فتح کرنے کے بعد ان کے سابق باشندوں کے حوالہ کرنے کے بجائے حکومت نے اپنے مقاصد کے لئے خاص کر لیا ہو[2]۔

ذمیوں کا پرسنل لاء اہل ذمہ کے پرسنل لا (Personal Law) میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت حسنؒ سے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ مجوس کے اپنی لڑکیوں اور سوتیلی ماؤں کے ساتھ نکاح کرنے کے معاملہ میں ہمارے پیشرو خلفاءؓ نے کوئی مداخلت نہیں کی؟ حضرت حسن نے جواب دیا، "آپ کو بہر حال انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنی ہے، اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کرنی ہے[3]"۔

اسی ایک بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذمیوں کو ان کے مذہبی معاملات اور پرسنل لا میں کس حد تک آزادی دی جائے گی۔

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

ان اصولی باتوں کو بیان کرنے کے بعد اب میں بعض عام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کی

---

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۰۱

[2] " " " ۹۷

[3] " " " ۳۶

کوشش کرونگا جو ذمیوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے طرزِ عمل سے متعلق اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں:۔

(۱) ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اظہار رائے و خیال اور دینی و مذہبی تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی۔ اِس خیال کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جہاں تک حکومت اُس کے نظم و نسق، اس کی پالیسیوں اور اس کے کارکنوں کا تعلق ہے ان پر بحث و تنقید کے بارے میں تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں بھی اسلام نے غیر مسلموں پر اس قید کے سوا کوئی قید عاید نہیں کی ہے۔ کہ وہ فساد انگیزی اور دل آزاری سے پاک ہو اور یہ قید جس طرح مسلموں کے لئے ہے، اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ خدا کے نبیوں اور رسولوں کی توہین و تحقیر کی اجازت نہ مسلمانوں کو دی جائے گی نہ غیر مسلموں کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں ایک عام اعلان یہ فرمایا تھا۔

من سب اللہ و رسولہ او سب احدا من الانبیاء فاقتلوہ۔	(الصارم المسلول)	جو اللہ اور اس کے رسول یا نبیوں میں سے کسی نبی کو برا بھلا کہے اس کو قتل کر دو۔

جس طرح نبیوں اور رسولوں کی تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جائے گی اسی طرح انسانیت اور حق کے عام خدمت گذاروں کی توہین و تحقیر کی بھی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی خواہ ان کا تعلق کسی قوم سے ہو۔ کیونکہ اسلام اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا کے ہادی ہر قوم میں آتے ہیں اگرچہ ان کی قوموں نے ان کی تعلیموں میں خرابیاں پیدا کر دیں۔

اس قید کے سوا دین کی تبلیغ میں کسی مذہب و ملت کے لوگوں پر بھی کوئی قید نہیں ہوگی۔ البتہ اسلام نے مسلموں یا غیر مسلموں کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ اُن بنیادی اصولوں کی "مخالفت" یا "تحقیر" کریں جن پر اسلامی ریاست قائم ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی اجازت اس آسمان کے نیچے نہ کسی حکومت نے آج تک کسی کو دی ہے۔ اور نہ کوئی حکومت اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ انگلستان کی حکومت اپنی رواداری اور مذہبی

غیر جانبداری کے لئے ضرب المثل بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے ملک کے اندر کسی شخص کو بھی یہ حق یا یہ اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ تاج برطانیہ کی حاکمیت کو چیلنج یا اس کی مخالفت یا تحقیر کرے۔ کیونکہ اس چیز پر انگریزوں کی سلطنت کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو اس کو کم سے کم غدر کبیر (High treason) کی سزا دی جائے گی۔ روس اور امریکہ میں ایسے جرم کے مرتکب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوگا۔ اپنی حفاظت خود اختیاری کے اسی حق کے تحت اسلامی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی شخص کو (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خدا کی حاکمیت کے خلاف آواز اٹھائے یا اس کی تردید یا تحقیر کی کوشش کرے، کیونکہ یہ چیز براہ راست سلطنت کی ہستی پر حملہ ہے اور اس کی قانونی حیثیت بعینہٖ وہی ہے جو انگریزی راج کے دوران میں تعزیرات ہند کے تحت "بادشاہ کے خلاف جنگ" (Waging War Against the king) یا "ریاست کی ہستی پر حملہ" (Depreaation against the State) کے جرائم کی تھی۔ تاہم اس معاملہ میں بھی آج تک دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی روشن خیال اور زیادہ سے زیادہ شہری آزادی (Civil Liberties) کی دعویدار حکومت اسلام کی برابری نہیں کر سکی۔ اس زمین کی سطح پر کبھی کوئی ریاست (بجز صحیح اور سچی اسلامی ریاستوں کے) ایسی نہیں گذری اور نہ اس وقت موجود ہے جس نے اپنے حدود اقتدار کے اندر اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین کے لئے پنپنے کی تو در کنار زندہ رہنے کی بھی گنجائش رکھی ہو۔ ہمارے پڑوس کے ملک میں کوئی شخص "دو قومی نظریہ" پر ایمان رکھ کر سانس نہیں لے سکتا۔ روس میں کمیونزم کے بنیادی اصولوں کے منکریں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اسلامی حکومت اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین اور مخالفین کو نہ صرف یہ کہ اپنے دائرۂ اقتدار میں پناہ اور وہ سارے حقوق دیتی ہے جن کا ابھی اوپر ذکر گذرا ہے بلکہ انہیں اس بات کا بھی پورا حق دیتی ہے کہ جو عقائد و نظریات وہ رکھتے ہیں ان پر قائم رہیں، ان کو اپنے اخلاف میں بطور ورثہ منتقل کریں، اپنے دائرہ کے اندر ان کی

حفاظت و ترقی کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بے روک ٹوک کریں۔ یہ ریاست ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ ان نظریات کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے برپا اور ان کو اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں پر بالفعل غالب کرنے کی کوشش کریں۔ غور کیجئے تو اس بارہ میں غیر مسلموں کو، اسلام نے مسلمانوں سے بھی زیادہ آزادی عطا کی ہے کیونکہ غیر مسلم تو اسلامی حکومت کے اندر اپنی پسند کے ہر دین و مذہب اور نظریہ و خیال کو اختیار کرنے کے لئے کاملاً آزاد ہیں مگر مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلام کے سوا کسی اور نظریہ و خیال کو اعتقاداً بھی اختیار کریں۔

(۲)۔ دوسری عام غلط فہمی، جو اول الذکر سے کچھ کم اہم نہیں، یہ پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کی حیثیت بس محکومِ محض کی ہوتی ہے۔ نہ ان کے لئے کوئی احترام ہوتا ہے، نہ ان کی کوئی آواز ہوتی ہے اور نہ ان کو اسلامی حکومت کی ملازمتوں اور اس کے دوسرے کاموں میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط فہمی ہی ہے۔ واقعات کی شہادت نہ صرف یہ کہ اس کی تائید نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ان کو حکومت کے مختلف شعبوں میں اپنی قابلیت کے جوہر نمایاں کرنے کا موقع دیا ہے۔ اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر کی نہر کا نقشہ ایک غیر مسلم (انجینئر) نے تیار کیا تھا۔ حکومت کے عام شعبے تو الگ رہے، غیر مسلم اسلامی جہاد میں حصہ لیتے رہے ہیں اور مال غنیمت میں مسلمانوں کی طرح حصہ پاتے رہے ہیں[۱] مثلاً:-

فتوحات ایران کے سلسلہ میں ایک معرکہ کے دوران میں حضرت عمرؓ کے سپہ سالار فوج، مُثنّٰی بن حارثہ، نے مشہور عیسائی قبیلہ بنی تغلب کے دو آدمیوں، انس بن ہلال نمری اور ابن مردی الفہر التغلبی کو جو مذہباً عیسائی تھے، بلایا اور ان سے کہا، اگرچہ تم ہمارے دین پر

---

[۱] نیل الاوطار، جلد ۸، صفحہ ۳۵

نہیں ہو لیکن بہر حال عرب (ہمارے ہم وطن) ہو اس وجہ سے تم دونوں میرے ساتھ رہنا اور جب میں ایرانی سپہ سالار مہران پر حملہ کروں تو میری مدد کرنا۔ چنانچہ مہران کو قتل کرنے والا نصرانی قبیلہ بنی تغلب ہی کا ایک نوجوان تھا۔ اس معرکہ میں مثنیٰ کے بھائی مسعود نے شہادت پائی اور اسی میں انس بن ہلال نمری بھی مارا گیا۔ معرکہ کے ختم ہونے پر مثنیٰ نے اپنے بھائی مسعود کی لاش کو بھی سینہ سے لگایا اور انس بن ہلال کی لاش کو بھی سینہ سے لگایا اور دونوں کا یکساں ماتم کیا۔[1]

مصر میں بنیامین قبطیوں کا ایک بڑا لیڈر تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ اس کو اپنی قوم کے اندر بڑا اعتماد حاصل ہے۔ تو انہوں نے عمرو بن عاص (گورنر مصر) کو لکھا کہ انتظام ملک میں اس سے مشورہ لیا جائے۔ چنانچہ عمرو بن عاص نے بنیامین کو قبطیوں کے سارے پرسنل لاء کا ذمہ دار بنا دیا۔[2]

ان سے اور اس طرح کی دوسری شہادتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلامی حکومت نے دو باتیں سامنے رکھی ہیں اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو دنیا کی کوئی حکومت بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اپنے طرز عمل سے اپنے آپ کو اعتماد کے لائق ثابت کریں اور اسلامی حکومت کے ساتھ ان کی وفاداری ہر پہلو سے غیر مشتبہ ہو۔ جن غیر مسلموں نے اپنے آپ کو اعتماد کے لائق ثابت کیا اُن پر مجرد اس بات کی وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کرنے سے انکار فرمایا اور نہ خلفائے راشدین نے۔ بنی خُزاعہ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ:۔

وکانت خزاعۃ عیبۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مشرکہا ومسلمہا۔	قبیلہ بنی خزاعہ کے مشرک اور مسلم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد تھے۔

چنانچہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے

---

[1] الفاروق عمر، تالیف محمد حسین ہیکل۔ صفحہ ۱۲۲، جلد ۲

[2] " " " " ۱۷۲، جلد ۲

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات نہایت اہم جنگی اور سیاسی فرائض ان لوگوں کے سپرد فرماتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر بنی خزاعہ کے مسلم اور غیر مسلم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں شریک تھے اور یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مکہ پر حملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درحقیقت انہی لوگوں کی مظلومیت کا بدلہ لینے کے لئے کیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت (Ideological State) ہے اس وجہ سے وہ اپنی کلیدی اسامیاں جن کا تعلق "پالیسی کے تعین" - Initiation and Formation of Policy - سے ہے، انہی لوگوں کے سپرد کرتی ہے جو ان اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں جن پر اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی ہے جس طرح روس کی اشتراکی حکومت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی وزارت خارجہ کا قلمدان کسی ایسے شخص کے سپرد کر دے جو اشتراکیت کا مخالف ہو یا اس پر ایمان نہ رکھتا ہو اسی طرح اسلامی حکومت کے لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ اپنے کسی ایسے عہدے کو جس کا تعلق حکومت کی پالیسی کے تعین سے ہے کسی ایسے شخص کے حوالہ کر دے جو اسلام کا مخالف ہے یا اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت بھی، جو کسی خاص اصول اور نظریہ پر مبنی ہو، ایسا نہیں کر سکتی اور نہ اس سے یہ مطالبہ کرنا جائز اور صحیح ہو سکتا ہے[1]۔ اس حد سے باہر ایک مسلم اور غیر مسلم میں جو فرق بھی ہوگا وہ صرف قابلیت، حسن کارکردگی اور اعتماد کی بنا پر ہوگا، نہ کہ مجرد مسلم اور غیر مسلم ہونے کی بنا پر۔

(۳) تیسری غلط فہمی، جسے اسلام کے ہوشیار دشمنوں نے دانستہ اور اس کے نادان دوستوں نے اپنی بے خبری سے کافی پھیلایا ہے، یہ ہے کہ یہ بات اسلامی حکومت کی گویا پالیسی اور پروگرام کا ایک جز ہے کہ وہ اپنے کاروبار اور معاملات میں ایسے طریقے اختیار کرے جن سے غیر مسلموں کی تحقیر و تذلیل ہو۔ ہر چند اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے فاتحین اور مفتوحین کے درمیان امتیاز رکھا ہے، لیکن یہ امتیاز نہ تو غیر مسلموں کی

[1] مگر ہمارے ملک میں ایسے بے باک جہلا کی کمی نہیں ہے جو علی الاعلان بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ غیر مسلم اسلامی حکومت کا صدر (امیر المومنین) تک بنا دیا جا سکتا ہے۔

تحقیر کی غرض سے ہے اور نہ فی الواقع اس میں تحقیر کا کوئی شائبہ شامل ہے۔ یہ امتیاز بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہر اصولی جماعت اپنے ارکان اور غیرارکان میں کرتی ہے اور کرنے پر مجبور ہے۔ جو معاشرہ بھی کسی عقیدے اور اصول پر قائم ہوگا اسے لازماً اپنے ارکان کو اس سے بچانا ہوگا۔ کہ وہ اس عقیدے اور اصول کے منکرین و مخالفین کے ساتھ گھل مل کر اس طرح یک جان ہو جائیں۔ کہ ان میں سرے سے کوئی فرق ہی باقی نہ رہ جائے۔

جن معاملات کی بنا پر لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلی ہے ان میں سے ہر معاملہ کے صحیح پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کے غلط پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض خاص خاص معاملات کی طرف اشارہ کر کے ان کے صحیح پہلو پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور بات یہ ہے کہ ذمیوں پر یہ بار ڈالا گیا تھا کہ ان کے شہروں میں جو مسلمان آئیں گے ان کی میزبانی اُن پر لازم ہوگی۔ اس میزبانی کی وجہ، جیسا کہ اس کی نوعیت اوپر مختصراً واضح کی جا چکی ہے، یہ تھی کہ اس زمانہ کے حالات کے تحت اس کے سوا کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں تھی۔ موجودہ زمانے میں جبکہ ہر علاقے میں حکومتوں کے اپنے ڈاک بنگلے موجود ہیں۔ ایسا کوئی بار کسی پر ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ذمیوں کو اس بات سے منع کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا سا لباس استعمال نہ کریں۔ اس حکم کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ذمی عام طور پر فوجی لباس پہننے لگ گئے تھے جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں اور مزید غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس وجہ سے انتظامی طور پر اُن کو اس سے روکا گیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے حیرہ کے ذمیوں سے جو شرط کی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَ لَهُمْ كُلَّ مَا لَبِسُوا مِنَ الزِّيِّ إِلَّا زِيَّ الْحَرْبِ[۱]۔ — یہ لوگ فوجی لباس کے سوا ہر لباس اختیار کر سکتے ہیں۔

---

[۱] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۸۵۔

ظاہر بات ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنے فوجیوں کی وردی کے عام استعمال کی لوگوں کو اجازت نہیں دیا کرتی ، اس وجہ سے اگر اسلامی حکومت نے بھی اس قسم کا کوئی حکم دیا تو دنیا کے معروف اور مسلّم طریقوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی ۔ رہی یہ بات کہ اس چیز نے مسلم اور غیر مسلم کے لباس میں فرق کی صورت اختیار کرلی تو اس کی وجہ تھوڑے سے غور سے یہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ اُس زمانے میں چونکہ مسلمانوں کے سارے قابل جنگ آدمی بالعموم جہاد ہی میں مصروف رہتے تھے اس وجہ سے فوج عملاً تقریباً پوری قوم پر مشتمل تھی اور پھر کوئی باقاعدہ مستقل فوج (Standing Army) نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے عام اور معروف لباس ہی نے ان کی وردی کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ ایسی صورت میں غیر مسلموں کو یہ حکم دینا کہ وہ فوج کی وردی نہ استعمال کریں دوسرے لفظوں میں یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ مسلمانوں کا لباس نہ اختیار کریں معاملہ کی اصل صورت یہی معلوم ہوتی ہے لیکن بعد میں راویوں کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ بات پھیل گئی کہ اسلامی حکومت ذمیوں کو مسلمانوں سے اپنا لباس مختلف رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

۳۔ تیسری چیز یہ ہے کہ عام تجارتی محصول اور چنگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض روائتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض جگہ کے ذمیوں اور مسلمانوں میں عشور (چنگی) کی وصولی میں فرق کیا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی اصولی چیز نہیں ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تو عشور کی سرے سے کوئی شرعی حیثیت ہے ہی نہیں (گویا یہ سراسر ایک انتظامی شے ہے[1]) اور جن کے نزدیک اس کی کوئی شرعی بنیاد ہے بھی وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ تجارتی عشور غیر مسلموں پر اسی

[1] اس رائے کی رو سے اوّل تو یہ بات اس طرح صاف ہو جاتی ہے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت نے ایسا کیا تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے بلکہ اس وقت کے حکومت چلانے والوں پر ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ فرق اس وجہ سے ہی کیا گیا ہو کہ وہ ذمی ہیں اور یہ مسلمان ہیں بلکہ اس فرق کے دوسرے بالکل جائز معاشی وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔

صورت میں لگائے جا سکتے ہیں جب اس بارہ میں ان سے خاص طور پر کوئی معاہدہ ہو چکا ہو ورنہ جزیہ کے سوا اور کوئی مطالبہ ان سے نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

۴۔ ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ عام شاہراہوں پر ذمیوں کو اپنے دوش بدوش چلنے کا موقع نہ دیں۔ اس بارے میں اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ابن عباس، ابو امامہ، ابن محیریز، قاضی عیاض، علقمہ اور نخعی جیسے لوگ اس بات کے قائل ہیں۔ کہ مسلمان ذمیوں کو سلام کرنے میں پیشقدمی کر سکتے ہیں[۲] ظاہر ہے کہ اس کے بعد کون باور کر سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے گی کہ وہ عام شاہراہوں پر غیر مسلموں کو اپنے دوش بدوش چلنے سے اس طرح روکیں جس طرح مدراس کے برہمن اچھوتوں کو روکتے ہیں۔

(۴) ۔ ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اسلامی تہذیب و معاشرت اور اسلامی حدود و حرام و حلال اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں مجبوراً مسلمانوں کے ذوق اور رجحان کی پیروی کرنی پڑے گی۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اسلامی حکومت میں ملکی (Common Law of the Land) اسلامی قانون ہی ہوگا —— اور ظاہر بات ہے کہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ریاست کے اسلامی ہونے کے سرے سے کوئی معنی ہی نہیں ہیں —— مگر جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے ریاست یا اس کا قانون غیر مسلموں کے مذہب، تہذیب، تمدن، اور پرسنل لاء میں دخیل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ شراب اور سور کا استعمال اسلام میں اگرچہ قطعاً ممنوع اور جرم ہے۔ مگر اسلامی حکومت غیر مسلموں کو اس سے نہیں روکے گی۔[۳] البتہ جس طرح دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی ایسی چیز کو روا نہیں رکھ سکتی جو معاشرے کی اجتماعی زندگی کو ریاست کے بنیادی اصولوں کے خلاف متاثر کرنے والی ہو۔ اسی طرح اسلامی حکومت اپنی حدود کے اندر

---

[۱] نیل الاوطار ۔ جلد ۸، صفحہ ۵۲

[۲] " " " ۵۶

[۳] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۰۲

کسی کو بھی مثلاً اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ قحبہ گری یا سودی لین دین کا پیشہ کرے۔ اگرچہ یہ کسی شخص یا گروہ کے نزدیک جائز اور کارِ ثواب ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ ملک کی اجتماعی زندگی کے اخلاقی اور معاشی نظام کو بگاڑنے والی چیزیں ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم عورتوں کو اگرچہ پردے کی شرعی حدود کا قانوناً پابند نہیں کیا جائیگا لیکن بہر حال ان کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ مغرب زدہ عورتوں کی طرح لوگوں کے اخلاق بگاڑتی پھریں۔

پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم اور ان کے حقوق

اسلامی قانون نے معاہد اہل ذمہ اور مفتوح اہل ذمہ (اہل عَنوہ) میں جس نوعیت کا فرق کیا ہے اور جس بنا پر کیا ہے اس کو میں نے، جس حد تک غیر مسلموں سے متعلق مسائل سمجھنے کے لئے ضروری تھا، واضح کر دیا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر اب اس سوال پر غور کیجئے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ ان کی حیثیت معاہد اہل ذمہ کی قرار پائے گی یا ان کو مفتوح اہل ذمہ کے حکم میں رکھا جائے گا؟ اس سوال کا جواب متعین ہو جانے کے بعد ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کا فیصلہ کرنا نہایت آسان ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کو مفتوح اہل ذمہ قرار دینے کے لئے کوئی معمولی سی وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ نہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کوئی جنگ کی ہے اور نہ حکومت پاکستان نے ان کو بزور شمشیر مغلوب کیا ہے۔ وہ تقسیم ہند کے لازمی نتیجہ کے طور پر پاکستان کے حصہ میں آئے ہیں اور اس تقسیم کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ دونوں قوموں کے ذمہ دار لیڈروں کے باہمی راضی نامہ سے ہوئی ہے، نہ کہ کسی جنگی فتح و تسخیر کے ذریعہ سے۔ اس وجہ سے تنہا یہی بات کہ یہ غیر مسلم ایک باہمی راضی نامہ کے تحت ہمارے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ان کو مفتوح و مغلوب رعایا کے زمرہ میں نہ رکھا جائے بلکہ معاہد اہل ذمہ کے زمرہ میں رکھا جائے۔ لیکن یہاں یہی ایک وجہ

نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو ان کے معاملہ میں قابل لحاظ ہیں اور جن کی بنا پر ان کا معاہد ہونا بالکل متعین اور طے ہو جاتا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) یہ کہ ابتدا سے اب تک اس ملک کے تمام ذمہ دار لیڈر متفق اللفظ ہو کر ان کو اس بات کا یقین دلاتے رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے اندر اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ نہ صرف یہ کہ منصفانہ سلوک کیا جائے گا۔ بلکہ نہایت فیاضانہ سلوک کیا جائے گا۔

(۲) یہ کہ تقسیم کے بعد اس ملک کا نظام چلانے کے لئے عارضی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو اپنایا گیا جس کی رو سے یہ غیر مسلم ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق اس میں محفوظ کئے گئے ہیں۔

(۳) پھر اس ایکٹ ۱۹۳۵ء کی جگہ جو دستور زیر ترتیب ہے اُسے مرتب کرنے کے لئے جو دستور ساز اسمبلی بٹھائی گئی ہے اُس کے غیر مسلم ارکان پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کے نمائندے ہیں اور اسمبلی کے ارکان ہونے کی حیثیت سے ان کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو اسمبلی کے مسلمان ارکین کو حاصل ہیں۔

یہ ساری باتیں اس بات کا کھلا ہؤا ثبوت ہیں کہ یہاں کے غیر مسلموں نے اپنی آزاد مرضی سے، اپنے مصالح کے تحت، اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور پاکستان کے ارباب حل وعقد نے بحیثیت ایک اقلیت کے ان کے ساتھ معاملہ کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس ذمہ داری اور اعتماد کا تقاضا، اس ملک میں ایک لادینی جمہوری ریاست (Secular Democratic State) کے قیام کی صورت میں تو یہ ہوتا کہ اُن کو اُس مفہوم میں ایک اقلیت قرار دیا جاتا جو موجودہ زمانہ میں اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے اور ان کے لئے وہی حقوق پاکستان کی کتاب دستور میں درج کئے جاتے جو اس زمانہ کی لادینی ریاستیں اپنے دساتیر (Constitutions) میں بالعموم ضابطہ کے طور پر درج کر دیتی ہیں۔ لیکن چونکہ برعظیم ہند کے مسلمانوں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا ہی اس غرض سے تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں

کو لادینیت کے اثرات سے بچا سکیں اس لئے جن غیر مسلموں نے پاکستان میں قیام کو اپنے لئے منتخب کیا انہوں نے یہ جانتے ہوئے ہی یہ انتخاب کیا کہ یہاں کا اجتماعی نظام بہر حال اسلامی ہی ہوگا اس لئے اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے۔ کہ ایک اسلامی نظام کے اندر ہم اُن وعدوں اور اعلانات سے کس طرح پوری ایمانداری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو ہم نے اِس ملک کے غیر مسلموں سے کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک اسلامی نظام کے اندر اس طرح کے غیر مسلموں کی حیثیت جو پاکستان میں ہیں " معاہد اہل ذمہ " کی قرار پائے گی اور ان کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس ملک کے آئندہ دستور میں ان کے حقوق کا تحفظ ہوگا۔

یہ سوال کہ ان کو کیا حقوق دیئے جائیں، اِس مضمون میں ہمارے طے کرنے کا نہیں ہے بلکہ مجلسِ دستور ساز کے اندر دونوں قوموں کے نمائندوں کے طے کرنے کا ہے۔ وہ جو کچھ طے کر لیں گے اگر اُس سے شریعت کے کسی اصول کی خلاف ورزی لازم نہ آ رہی ہو تو اس پر اللہ کا اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو جائے گا اور اسلامی حکومت کے لئے، اس کے بعد، اس میں نقصاً اصناً یا عملاً ایک شوشہ کے برابر بھی کمی کرنا جائز نہ ہوگا الّا یہ کہ دوسرے فریق نے اپنی ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کے اٹھانے سے انکار کر دیا ہو اور اس معاملہ میں اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ تاہم اگر ہم یہاں بالاجمال یہ بتا دیں کہ شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ بحیثیت معاہد اہل ذمہ کے معاملہ کرنے میں کس حد تک وسعت ہے تو شاید اس سے ان لوگوں کو کچھ مدد ملے جو اس وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں چند اشارات کروں گا جن کو سامنے رکھ کر ان کے حقوق کے متعلق ایک ضابطہ بنایا جا سکتا ہے۔

خراج سے برأت اگر ان لوگوں کو خراج کی ادائیگی یا اس نام سے کوئی رقم ادا کرنے پر اعتراض ہو تو ان کو خراج سے بری کیا جا سکتا ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور دوسری آمدنیوں پر ان سے بھی وہی صدقات وصول کئے جا سکتے ہیں جو مسلمانوں سے وصول کئے جائیں گے اس کے سوا کوئی اور مناسب شکل بھی، جو فریقین کے درمیان طے ہو جائے، اختیار کی جا سکتی ہے بشرطیکہ

وہ شکل شریعت کے خلاف نہ ہو اور اس کے اختیار کرنے میں بیت المال (State — Exchequer) کو خسارہ نہ ہو۔[1]

جزیہ سے برأت | اگر ان لوگوں کو جزیہ کے نام سے کسی رقم کی ادائیگی یا نفس جزیہ ہی کی ادائیگی پر اعتراض ہو تو ملک کے دفاع کے سلسلہ میں ان پر جزیہ کے بجائے کسی دوسرے نام سے بھی ٹیکس لگایا جا سکتا ہے اور اگر وہ ملک کے دفاع میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ حصہ لینے کے لئے تیار ہوں تو انہیں جزیہ کی نوعیت کے کسی ٹیکس کی ادائیگی سے بالکل بری بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس آخر الذکر صورت میں اسلامی حکومت کے سامنے جو سوال قابل غور ہوگا وہ صرف یہ کہ آیا انہوں نے اپنے طرز عمل سے ملک کی وفاداری کا ایسا ثبوت دیا ہے۔ کہ دفاعی معاملات میں حکومت ان پر اعتماد کر سکے۔ اگر یہ صورت ہے تو ان کو ملک کے دفاع میں براہ راست حصہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور اس مقصد کے لئے ان کو فوج میں ذمہ داری کے عہدے دیئے جانے میں اصولاً کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ لیکن حکومت کے بنیادی مقصد کے تحت ان کو پالیسی کے تعین اور اسلامی جنگ کے اصول و ضوابط پر اثر انداز ہونے کا موقع کسی حال میں نہیں دیا جا سکتا۔[2]

[1] یہ اور اس کے علاوہ دوسری باتیں جو اس باب میں ناظرین کے سامنے آئیں گی ان کے دلائل اوپر گذر چکے ہیں اس وجہ سے ان کو یہاں نہیں دہراؤں گا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی جس کے دلائل کی تفصیل اوپر نہیں کی جا سکی ہے تو اس کے ماخذ کا بقدر ضرورت یہاں پتہ دے دیا جائے گا۔ براہ کرم کوئی صاحب بغیر پورے مضمون کو بغور پڑھے ان نتائج بحث پر کوئی رائے نہ قائم فرمائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ فتنہ میں پڑیں گے۔

[2] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث میں اس سلسلہ کے ایک مستقل مضمون میں کروں گا لیکن ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے اس وجہ سے مختصراً اتنا یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ فقہا کا ایک گروہ اسلامی جہاد میں غیر مسلموں کی شرکت کو جائز نہیں قرار دیتا لیکن ایک دوسرے گروہ کے نزدیک (اگلے صفحہ پر)

مذہبی آزادی ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو پوری آزادی دی جاسکتی ہے۔ پاکستان کے جن شہروں اور دیہاتوں میں وہ آباد ہیں وہاں ان کو جو مذہبی آزادی اب تک حاصل رہی ہے اس کو بدستور باقی رکھنے کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اس بارے میں ان پر وہی پابندیاں عائد ہوں گی جو ملک کے دوسرے شہریوں (مسلمانوں) پر ملک کے عام قانون کے تحت اس معاملے میں عائد کی جائیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) پہلے ان سے استعانت ناجائز تھی مگر بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی۔ یہ مذہب امام شافعی کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ اہل بیت، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ کفار وفساق سے بسلسلہ جہاد استعانت میں کوئی ہرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ لوگ اس سلسلہ میں اسلامی قوانین جنگ اور امام کے امر ونہی (Discipline) کے پابند رکھے جاسکیں۔ ان لوگوں کا استدلال مختلف احادیث اور واقعات سے ہے جن کی تفصیل کے لئے یہاں موقع نہیں ہے۔

بعض علماء جن میں ہادویہ جیسے لوگ شامل ہیں کہتے ہیں کہ جہاں امام کے ساتھ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت ہو کہ ان کے بل پر وہ اسلامی احکام وقوانین ان لوگوں کے اندر جاری کر سکے جن کے خلاف فوج کشی کی گئی ہے وہاں غیر مسلموں سے استعانت میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اور یہ امر اپنی جگہ پر طے شدہ ہے کہ اگر ذمی مسلمانوں کے ساتھ ملک کی مدافعت اور دوسرے جنگی اقدامات میں شریک ہوں گے تو ان کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا۔ دہستان اور جرجان کے معاہدہ صلح میں ان مقامات کے باشندوں سے مسلمانوں کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ:-

من استعنا به منکم فله جزاءه — تم میں سے جو لوگ ہمارے (مسلمانوں کے) ساتھ
علی معونته عوضا من جزائه — دفاع اور جرم میں شریک ہوں گے ان کا اس کے
(الفاروق عمر - جلد ۲، صفحہ ۱۳۰) — عوض میں جزیہ معاف

اسی طرح الباب یا باب الابواب کے رئیس، شہر براز، نے جب مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع پائی تو اسلامی فوج کے سپہ سالار عبدالرحمن بن ربیعہ کو لکھا کہ:-

انی بازاء عدو کلب وامم مختلفة — میں آپ کے سخت دشمن اور مختلف قوموں کے

تہذیب و تمدن اور پرسنل لاء کی آزادی ــــ	ان چیزوں کے بارے میں بھی ان ساری آزادیوں کی ضمانت دی جاسکتی ہے جو انہیں اب تک کے ملکی قانون کے تحت

حاصل رہی ہیں۔

شہری آزادیاں یعنی اظہار رائے و خیال، تبلیغ مذہب اور تنقید و اجتماع کی آزادی۔	ان سب چیزوں میں بھی ان کو وہی حقوق دیئے جا سکتے ہیں جو ملکی قانون کے تحت اس ملک کے کسی

دوسرے شہری کو حاصل ہوں گے۔

قانون سازی میں حصہ	مطلق قانون سازی کا حق، ہر شخص کو معلوم ہے، اسلامی ریاست کے اندر

کسی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نہ کسی مسلم کو نہ غیر مسلم کو۔ جن معاملات میں اللہ اور رسول کے احکام

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) و لست انا من القبج ولا من الارمن فی شیئ و انکم قد غلبتم علی بلادی و امتی - فانا منکم و یدی مع ایدیکم و جزیتی الیکم والنصر لکم و القیام بما تحبون - فلا تذلونا بالجزیۃ فتوھنونا لعدوکم۔

بالمقابل ہوں اور قبج اور ارمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ لوگ اب میرے ملک اور میری قوم پر غالب آچکے ہیں۔

اب میں آپ میں سے ایک شخص ہوں، میری قوت آپ کے ساتھ اور میرا جزیہ اور میری مدد آپ کے لئے ہے اور میرا فرض ہے کہ آپ جو کچھ پسند کریں اس کی تعمیل کروں۔ اس وجہ سے بہتر یہ ہے کہ آپ ہم پر جزیہ عاید کر کے ذلیل نہ کریں ورنہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم آپ کے دشمن کے لئے کمزور ہو جائیں گے۔

عبدالرحمٰن نے شہر براز کی درخواست اس ترمیم کے ساتھ منظور کر لی کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں حصہ لینگے انکا جزیہ معاف کر دیا جائیگا اور تصدیق کیلئے اپنے اس فیصلہ کو امیر عسکر سراقہ بن عمر کے پاس بھیجا۔ سراقہ نے اس کی اطلاع امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کو کی۔ انھوں نے اس کی اجازت دی اور اس کی تحسین فرمائی۔ (الفاروق عمر۔ جلد ۲ صفحہ ۱۵۰)

موجود ہوں گے، اسلامی حکومت ان معاملات میں ان کو بلاکم وکاست جاری کرے گی۔ جن معاملات میں کوئی صریح قانون موجود نہ ہوگا ان کے بارہ میں اللہ اور اس کے رسول کی شریعت میں درک رکھنے والوں اور حالات اور مصالح پر اسلامی نظر سے غور کرنے والوں کا یہ کام ہوگا کہ وہ بتائیں کہ ان میں اسلامی شریعت کے مزاج سے کیا بات قریب تر ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں غیر مسلم نہ کوئی مدد دے سکتے ہیں اور نہ انہیں اس کام میں شریک کرنے کے کوئی معنی ہیں۔ البتہ جن امور کا تعلق عام مصلحت یا عام انتظامی معاملات سے ہے ان میں غیر مسلموں کے مشوروں سے بھی حکومت اسی طرح فائدہ اٹھائے گی جس طرح مسلمانوں کے مشوروں سے فائدہ اٹھائے گی۔ بلکہ ایسے امور سے متعلق قانون سازی کے معاملات میں انہیں شریک بھی کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کو اس بات کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ایک ایسی اسمبلی بنالیں جو ان کے مذہبی اور تہذیبی اداروں کی نگرانی بھی کرے اور ان کے پرسنل لاء کے دائرہ کے اندر قانون سازی کے لئے سفارشات بھی مرتب کرے۔

ملازمتیں اور عہدے بجز اُن کلیدی مناصب (Key Posts) کے جن کا تعلق پالیسی کے تعین سے ہے یا وہ پالیسی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں یا جن سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لئے اسلام اور اسلامی قوانین کے علم و تفقہ کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کے ہر شعبہ میں غیر مسلموں کو ملازمتیں دی جا سکتی ہیں اور ہر درجہ کی ملازمتیں دی جا سکتی ہیں۔ ان مناصب کے علاوہ باقی ہر عہدہ اور ہر چھوٹی بڑی ملازمت کے لئے صرف قابلیت، وفاداری، امانت و دیانت اور حسن کارکردگی کے اوصاف ہی فیصلہ کن شرائط کی حیثیت رکھیں گے۔

روزگار اور کفاف کا ذمہ غیر مسلموں کے بے کاروں کے لئے روزگار مہیا کرنے کا اور ان کے معذوروں اور ان کے متعلقین کے لئے بیت المال سے ان کی ضرورت کے مطابق وظیفہ کا ذمہ لیا جا سکتا ہے۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ میرا مقصد یہاں غیر مسلموں کے تمام حقوق کی فہرست مرتب

کرنا نہیں ہے بلکہ ان چند موٹی موٹی اصولی باتوں کو بیان کرنا ہے، جن کے بارہ میں ذہنوں میں سوالات موجود ہیں۔ باقی رہیں وہ باتیں جن کا تعلق عام انسانی حقوق سے ہے اور جن کے احترام کا ہر شخص قائل ہے ان کے ذکر کرنے کی میں نے ضرورت نہیں سمجھی ہے۔ ناظرین اس خلا کو خود بھر لیں گے

میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کے لئے ان حقوق کی ذمہ داری لی جاسکتی ہے۔ اور ایک مرتبہ ان کی ذمہ داری لے لینے کے بعد اپنے ایمان و اسلام اور اپنی عاقبت کو خراب کئے بغیر کوئی حکومت ان حقوق پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ عظیم ذمہ داری اٹھانے کے بعد بھی اس بات کا امکان ہے کہ ان حقوق پر دست درازی کی جائے — تاریخ اس قسم کی افسوسناک مثالوں سے خالی نہیں ہے — لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کا وہ کونسا نظام ہے جو اپنے اندر کی اقلیتوں کو اس سے بڑھ کر حقوق دیتا ہے۔ اور اس سے بڑی ضمانت دیتا ہے۔ اور وہ کونسا نظام ہے۔ جن کی نسبت یہ اطمینان کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس میں ایک مرتبہ اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہو جانے کے بعد بس ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اگر فی الواقع اس قسم کا کوئی نظام موجود ہے تو ہم اقلیتوں کو اس بات پر کوئی ملامت نہیں کریں گے۔ کہ وہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اسی نظام کے لئے مطالبہ اور اصرار کریں۔ لیکن کیا فی الواقع کوئی ایسا نظام موجود ہے ؟ کیا ایک لادینی جمہوری نظام کے قیام کی صورت میں وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ ان کے حقوق ہر قسم کی تاخت و تاراج سے محفوظ ہو گئے ؟ کیا اگر کاغذ پر یہ بات لکھ دی جائے کہ پاکستان کے سارے ہندو اور مسلمان اور عیسائی وغیرہ ایک قوم ہیں تو اس لکھ دینے کی وجہ سے یہ ایک قوم بن جائیں گے ؟ کیا اگر ہم ایک لادینی ریاست قائم کرکے کسی ہندو یا عیسائی کو نمائشی طور پر وزیر اعظم یا صدر جمہوریہ کی کرسی پر بٹھا دیں تو فی الواقع ہندو یا عیسائی اس ملک میں حکمران بن جائیں گے یا حکمرانوں کی صف میں آجائیں گے ؟ ان سارے سوالوں پر جذبات سے الگ ہو کر واقعات کی دنیا میں غور کرنا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دھوکے آج کل عام ہیں۔ ہر جگہ دیئے بھی جا رہے ہیں اور ہر جگہ یہ کھائے بھی جا رہے ہیں۔

اور اگر طفل تسلی ہی مقصود ہے تو یہاں بھی اس قسم کی باتیں کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کی باتوں سے کیا فائدہ؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس قسم کی بہلا دے کی باتیں کی جائیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے غیر مسلم بھائی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ لادینی جمہوریتوں میں اقلیتوں کا جو حال ہوتا ہے اس کے لئے انہیں ماضی کی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے پڑوس کے ملکوں سے اس کے لئے بہت کچھ سبق آموز مواد آج آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں، اور آئندہ بھی حاصل کر سکیں گے۔ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ملک میں ان لوگوں کو آزما دیکھیں جو خدا اور رسول کے نام پر ان کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں خدا کے نام پر ذمہ داری لینے کے بعد بھی بے وفائیاں ہوتی رہی ہیں۔ تاہم خدا کا نام تمام ضمانتوں سے بڑی ضمانت ہے اور اگر یہ نام بھی ہماری حفاظت نہ کر سکا اور ہم کو ظلم اور ناانصافی سے نہ روک سکا تو پھر کوئی چیز بھی نہ ہماری حفاظت کر سکتی ہے اور نہ ہم کو ظلم اور زیادتی سے روک سکتی ہے۔

رکھنے سے کتنی مدت اجتناب کرنا چاہئے، اس سوال کا انحصار جتنا اس کے داخلی حالات پر ہوتا ہے اُس سے کہیں زیادہ خارجی تقاضوں پر بھی ہوتا ہے۔ پھر داخلی اور خارجی تقاضوں میں توازن کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتی ہے۔

جماعت اسلامی ابتدائی تیاری کے دور کو لمبا کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے میدانِ کار میں طلب کر لیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آویزش دھیمی دھیمی چلی آ رہی تھی، وہ تقسیمِ ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جبکہ حالات بتا رہے تھے کہ اس کشمکش کا فیصلہ اِدھر یا اُدھر بہت جلد ہو جانے والا ہے اور آزادی کے بعد کے ابتدائی ۵ سال (یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال) اسلام کے لئے بالکل فیصلہ کن ہیں تو جماعت اسلامی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ ہمہ تن "عشق" بنے اور "بے خطر آتشِ نمرود" میں کود جائے۔ اس موقع پر عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی اہم موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لئے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر یہ دریا الحاد (Secularism) کے رخ بہ جانے کے بعد جب کنارے کاٹتا ہوا اپنی رہ گذر کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑنا دنیا کا ایک محال کام ہوگا۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول، اپنی حریف طاقتوں، اپنے دور کی تاریخ، اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے "نہ میں جنیدم نہ جنید گل محمد" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن و سیاست کی ساری بازی شاطرِ الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لئے آخری ہلہ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقوٰی کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لئے گھروں کے دروازے بند کئے بیٹھے رہیں۔ جماعت اسلامی نے جس روز مطالبۂ نظامِ اسلامی کی تحریک شروع کر کے عوامی دور میں قدم رکھا ہے، حالات گواہ ہیں کہ یہ کام اُس روز سے موخر کرتا مہلک ہوتا

وقت کی پکار کو اگر ہم لوگ اس کان سن کر اس کان اڑا دیتے تو آج "قراردادِ مقاصد" میں جوہرِ اسلامیت کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا بلکہ یہ کھلم کھلا لادینی ریاست کی تعمیر کا ایک اسلام کش اعلان ہوتی اور آج ہماری مملکت کی گاڑی غیر اسلامی راستے پر نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہوتی۔

پس اب جبکہ ایک قدم اٹھ چکا ہے، اس کے واپس لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ اب اس کا رکنا یا پیچھے ہٹنا ـــــ چاہے وہ تعمیرِ سیرت ہی کے لئے کیوں نہ ہو ـــــ ایک معرکۂ کشمکش سے فرار کی حیثیت رکھتا ہے، اور فرار ایک انقلابی تحریک کے لئے ہمیشہ موت ثابت ہوتا ہے۔ اس فرار کے بعد ایک جماعت محض مذہبی فرقہ یا سیاسی جتھا بن کے رہ جاتی ہے، وہ زمانے کی امامت نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک یہ ناگزیر ہے کہ تعمیرِ سیرت کے لئے جو کچھ بھی اہتمام کیا جائے وہ اس کشمکش کو جاری رکھتے ہوئے کیا جائے جو ایک فرض بن کر ہمارے اوپر لازم ہو چکی ہے۔

اب یہ ممکن نہیں ہے کہ عوامی دور میں قدم رکھنے کے بعد ہم لوگ ان ذرائع و وسائل سے کام نہ لیں جو سیاست کے عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جب سنہ ۴۸ء میں کراچی کی تقریر کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ آپ مطالبے کو منوانے کے لئے کن طریقوں سے کام لیں گے تو موصوف نے صفائی سے یہ جواب دیا تھا کہ ہمیں اس کے لئے وہ سارے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو آپ نے مطالبۂ پاکستان کے لئے اختیار کئے تھے۔ (ان کے خلافِ اسلام پہلوؤں کا استثنا بہر حال اپنی جگہ پر مسلّم ہے)

اوپر کی گذارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ اسلام کے ایک تحریک کی صورت میں ارتقاء کرتے ہوئے طبعی طور پر جو مراحل اسے پیش آ رہے ہیں، اور آنے والے ہیں، اُن کو ہمارے معترضین اور ہمارے خیر خواہ دونوں جامد مذہبیت، اور مغربی سیاست کی تفریق کی عینکوں سے نہ دیکھیں، اور قدم قدم پر اکھاڑنا چھوڑ دیں۔

دماغوں کو ذرا تنگ بنائیے، نگاہوں کو دور رس بصیرت کا درس دیجئے، سینوں کو فراخ دکھیئے اور حوصلوں

کو عالی ظرفی کی صفت سے آراستہ کیجیے، یہاں تک کہ آپ پیش آمدہ مراحل کے تقاضوں ہی کو نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بتدریج پیش آنے والے احوال و مقامات کی ذمہ داریوں کو قبل از وقت سمجھ سکیں۔ آپ کو اپنے ملکی ماحول ہی کو نہیں، جہانی ماحول کو تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔ آپ کی تاریخ کی سمتِ ارتقاء اور وقت کے بہاؤ کی رفتار کو جاننا چاہیے۔ آپ کو اسلام کی وسعتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے، اس کے بغیر اسلام کی انقلابی تحریک کے ہر نئے مرحلے میں داخلے کے وقت آپ کو خواہ مخواہ کی الجھن ہوگی۔

خود ہمارے لئے یہ صورتِ حالات بہت ہی مضر نتائج رکھتی ہے کہ ہم اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں، اور ہمارے معترضین سامنے سے آکر ہمارے لئے رکاوٹ بنیں اور ہمارے خیر خواہ پیچھے سے پکڑ کر ہمیں کھینچ رہے ہوں۔

معترضین سے تو ہم زیادہ توقعات وابستہ نہیں کر سکتے، البتہ اپنے خیر خواہوں سے ضرور یہ امید کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تصریحات پر وہ خاص طور پر غور و فکر کر کے جماعت کی راہِ عمل کا ایک صحیح اندازہ قائم کریں گے۔ کہ وہ کدھر سے ہو کر کدھر کو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اگر ایک مرتبہ ذہن نشین ہو جائے تو پھر انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا۔ کہ قدم قدم پر آپ اپنے اندر ایک ذہنی انتشار محسوس کریں اور ہر مرحلے پر ارشاد فرمائیں۔ کہ "لقد جئت شیئاً امراً" (سورۃ کہف)

رسائل و مسائل

زمیندار، مزارع اور اسلام

سوال :

علامہ مودودی کا رسالہ " ملکیت زمین " نظر سے گذرا ۔ پڑھ کر یہ معلوم ہوا کہ اسلام کا اقتصادی[1] نظام نہ صرف زمینداری کو جائز سمجھتا ہے، بلکہ ضروری سمجھتا[2] ہے ۔ اور اسلامی نظام کی پوری مشینری یعنی فوج و پولیس ۔ کے زمیندار کے اختیارات[3] کی حفاظت کرے گی، اور یہ دیکھے گی کہ اس کی زمینداری صحیح و سالم[4] ہے بخلاف اس کے کاشتکاروں کے حقوق "محض[5] اخلاق" کے بلند ہونے ہی پر پورے کئے جا سکتے ہیں ہم نے مانا کہ اسلامی نظام میں زمیندار اور کسان کی باہمی رضامندی پر ہی معاملات طے ہوں گے، لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں موجودہ زمانہ میں بھی یہی ہوتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کسان اس پوزیشن میں کب ہوتا ہے کہ وہ زمیندار سے اس کی مرضی کے خلاف احتجاج کرے اور کام نہ کرے ۔

پھر زمیندار یہ کرتا ہے کہ وہ بھوکے اور خستہ حال کسانوں کو قرض دے کر احسان مند کرتا ہے اور اس طرح ناجائز فائدے اٹھاتا ہے ۔ مثلاً مقامی پالیٹکس میں دخل اندازی ۔ اسمبلی کی نشست کے لئے ووٹوں کا حاصل کرنا

---

[1] زمینداری بہ شکل موجودہ نہیں، بلکہ بصورتِ جائز ۔ [2] زمینداری کو ضروری نہیں سمجھتا، بلکہ حقِ ملکیت کو انسانیت کے لئے ضروری سمجھتا ہے ۔ [3] مولانا مودودی نے یہ دعویٰ نہیں کیا، یہ الفاظ خود آپ نے اسلام کے سر ڈال دیئے ہیں، تحفظ صرف جائز ملکیت اور جائز حقوق کا ہو سکتا ہے، نہ کہ غیر محدود اختیارات کا ۔ [4] یہ محض ایک کھوکھلا طنز ہے ۔ اسلامی حکومت زمیندار اور مزارع کے درمیان انصاف کو قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے اور وہ صرف یہ دیکھے گی کہ یہ انصاف صحیح و سالم ہے یا نہیں ! [5] یہ "محض اخلاق" کی بات بھی من گھڑت بات ہے ۔

[6] آپ "نئی بات" چاہتے ہیں یا اسلام کا فیصلہ !

وغیرہ۔ علاوہ بریں وہ پبلک فنڈز میں بڑے بڑے چندے دے کر حکومت میں دسترس پیدا کر لیتا ہے۔ بمقابل اس کے غریب لوگوں کے حقیر چندے کچھ بھی شمار نہیں ہو سکتے۔

آپ مجھے دنیا کا کوئی ایسا ملک دکھا دیجیے جہاں سرمایہ دار اور زمیندار موجود ہے[1] اور اقتدار اس کے پاس نہیں ہے!

پھر یہ کہ ایک زمیندار گھر بیٹھا کسان کی محنت پر دن گذار سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس کا باپ جائداد چھوڑ گیا ہے۔ اور اس طرح وہ ملک کی دولت میں اضافہ کئے بغیر دوسروں کی محنت کے بل پر بیٹھا کھاتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل حرام خور کی سی ہے۔ اسلامی ریاست کے لیے یہ کتنا دردناک عذاب ہوگا کہ وہاں ایک طبقہ بالکل بیکار بیٹھ کر عیش و عشرت کی زندگی گذارے گا۔

قانونِ وراثت بھی اس معاملے میں ایک بیکار ہتھیار ہے۔ سیٹھ عبداللہ ہارون کا جب انتقال ہوا تو ان کی جائداد ان کے چار بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ اب ان کے چار بیٹوں کی دولت بڑھتے بڑھتے ہر ایک کے پاس اتنی ہو گئی جتنی کہ سیٹھ ہارون کے پاس تھی۔ کیا اثر ہوا ہماری اقتصادیات پر؟[2]

میری رائے یہ ہے کہ مودودی صاحب نے پوری کتاب زمینداروں کے حقوق تسلیم کرانے کے لیے لکھی ہے۔ لیکن بیچارے کسانوں نے کیا جرم کیا تھا کہ ان کے حصے میں پوری کتاب میں سے صرف آدھا صفحہ آیا۔ وہ بھی حد درجہ تشنہ۔ بہرحال انصاف کا تقاضا تو اس کے خلاف ہے!

جواب:

آپ کی ذہنی پریشانی کی اصل وجہ کی نشاندہی خود آپ کے خط سے ہوتی ہے۔ آپ اسلام کے سامنے "وقت کا تقاضا" اور "زمانے کا ذہنی رجحان" لا کے رکھتے ہیں کہ وہ اس کی تصدیق کرے۔ جب وہ ایسا

---

[1] مگر براہِ کرم پہلے آپ ہی کسی ایسے ملک کی نشاندہی فرما دیجیے جس میں اسلام بحیثیت نظامِ زندگی کار فرما ہو اور پھر ہم سے یہ سوال کیجیے گا۔ بہتر ہو کہ آپ ہی یہ بتا دیں کہ کہیں کوئی ایسا ملک بھی ہے جہاں قومی ملکیت کا نظام ہو اور پھر وہاں انسانی آزادی کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہو۔

[2] سرمایہ داری کا رجحان اس کے برعکس ہوتا ہے کہ وہ چار سرمایہ داروں کو ملا کر ایک بنا دیتا ہے۔ لیکن ہمیں جوش مساوات نے یہ کہ وہ ایک سرمایہ دار کے چار بنا دیتا ہے اور یوں سے کی قوت بالکل لامرکزیت پر منتشر ہو جاتی ہے۔

نہیں کرتا تو آپ مضطرب ہو جاتے ہیں اور اضطراب قسم قسم کے سوالات کی شکل اختیار کرتا ہے۔

دراصل ہمارے گرد و پیش کی فضا پر کمیونسٹ فلسفہ اپنا پرتو اتنا گہرا ڈال چکا ہے کہ اس کے مخالفین تک میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قومی ملکیت کے اصول سے ورے ورے کوئی حلِ مشکلات اختیار کرتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں تنگ نظر، پست فکر اور تاریک خیال سمجھا جائے گا، اور اس بات سے ڈرتے بھی ہیں کہ ہم پر سرمایہ داری کی حمایت و تائید کا الزام چپک دیا جائے گا۔ اس وجہ سے وہ کسانوں اور غریب طبقوں کو مظلومی سے نکالنے کے لئے صرف ایک ہی حل کو برحق قرار دیتے ہیں کہ سرمایہ و زمین اور ذرائع و وسائل کو افراد سے چھین کر ریاست کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ نہیں ہوتا کہ غریبوں کی مشکلات کا حل بتاؤ، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہی حل بتاؤ جس کا دنیا میں چرچا ہے اور جسے بہت سے لوگ مان چکے ہیں۔ پھر مطالبہ اتنا ہی نہیں ہوتا کہ اس حل کی حمایت کرو بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسی کو اسلامی حل بھی قرار دو!

ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ پہلے اس طرزِ فکر سے اپنے آپ کو الگ کریں، اور اپنے ذہن کو اس حقیقت پر جما دیں کہ وقت کے رجحانات اور تقاضے، اور ہماری خواہشات اور جذبات ایک شے ہیں، اور اسلام ایک شے ہے۔ یہ دونوں ہر حال میں ایک نہیں ہوتے۔ پھر دوسری چیز یہ طے کریں کہ آپ وقت کے رجحانات اور اپنی خواہشات کو اسلام پر قربان کرنا صحیح سمجھتے ہیں یا اسلام کو ان کا تابع بنانا لازم جانتے ہیں۔ اب اگر یہ طے ہو جائے کہ آپ اسلام ہی کو معیارِ فیصلہ بنا کے چلیں گے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ساری گرہیں یکے بعد دیگرے کھل جائیں گی۔

مودودی صاحب کی خصوصیت جس نے انہیں ہماری تاریخ میں ایک امتیازی مقام پر لا کھڑا کیا ہے یہی ہے کہ وہ اسلام کو معیارِ فیصلہ مان لینے کے بعد وقت کے رجحانات اور اپنی خواہشات سے احکام اخذ نہیں کرتے، بلکہ کتاب و سنت سے انہیں جو کچھ حق معلوم ہوتا ہے، اسے پورے اعتماد اور زورِ استدلال کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس خطرناک جرأت سے کام لیتے ہوئے ان کو نہ تو احساسِ کمتری لاحق ہوتا ہے، نہ انہیں ملائیت اور تاریک خیالی کے الزامات سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور نہ بندگانِ ماحول کے طنز آمیز القابات کی پرواہ وہ کرتے ہیں۔

پس اُن کی کتاب پر تنقید کرنے کے حق کو استعمال کرتے ہوئے آپ ایک مسلم کی طرح یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ انہوں نے کتاب و سنت کو استدلال کا مرکز بنایا ہے یا کسی اور چیز کو؟ اور پھر جو استدلال کیا ہے وہ صحیح ہے یا اس میں کوئی گڑبڑ کی ہے۔ پھر اگر آپ دیکھیں کہ انہوں نے اسلام ہی کے مآخذ سے استدلال کیا ہے اور استدلال میں کوئی اختلال نہیں ہے تو اسے قبول کریں، لیکن اگر آپ ایسا نہ پائیں تو مولینا مودودی تو کیا دنیا بھر کے علماء و مقدسین بھی اگر جمع ہو کے کسی غیر اسلامی دعوے کو سامنے لائیں تو اسے رد کر دیں ۔۔۔ اور خود کتاب و سنت سے صحیح استدلال کریں یا کسی دوسرے ماہر سے استفادہ کریں۔ یہ ہے ایک مسلمان کا سا طرزِ فکر!

لیکن یہ کوئی درست طریقہ نہیں ہے کہ ایک شخص اسلام کے اصلی مآخذ سے صحیح استدلال کر کے کوئی حقیقت سامنے لائے، اور وہ حقیقت فی نفسہٖ ہمیں ناپسند ہو تو بجائے اس کے کہ اس اصل حقیقت کے خلاف اپنی رائے دیں، سارا الزام اسے پیش کرنے والے پر رکھیں۔ اسلام سے کسی کا دل مطمئن نہ ہو سکے تو وہ کیوں نہ وہ ہمت کر کے خود اسی کو چھوڑ دے۔ اس کی ترجمانی کرنے والے سے الجھنا کیا فائدہ دے گا۔ اگر اسلام انفرادی ملکیت کا حق مانتا ہے، اگر وہ بالمعاوضہ کسی کی محنت خریدنے کی اجازت دیتا ہے تو جس کسی کو یہ چیزیں ناپسند ہوں اور جو ان کو حق کے خلاف پاتا ہو، اس کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ مردِ کار بنے اور خود اس فلسفہ و نظام کے خلاف علم اٹھائے جو ان نظریات کو ساتھ لایا ہے لیکن اسلام سے غیر اسلام کی تصدیق و حمایت چاہنا اور اس کے لئے "جدید اسلام" کے بانیوں کا سا طریقِ فکر اختیار کرنا بہت ہی افسوسناک حرکت ہوگی۔

اس کھری کھری تمہید کے بعد سوال کے اہم اجزا کا جواب درج ذیل ہے:۔

(۱) کاشتکاروں کے حقوق کی ادائی کو "محض اخلاق" پر منحصر ٹھہرانے کا الزام مودودی صاحب کو دینا زیادتی ہے۔ اس مقصد کے لئے قانون کو بھی اور دوسرے ذرائع کو بھی کام میں لائے بغیر چارہ نہیں۔ مولینا مودودی مدظلہٗ نے حسب ذیل قانونی اقدامات کو بنیادی طور پر ضروری قرار دیا ہے:

۱۔ علماء دین و ماہرینِ اراضیات و مالیات کا ایک مشترک کمیشن جاگیروں اور زمینداریوں کی

چھان بین کرے اور تمام ناجائز ملکیتوں کو بلا معاوضہ ادا کئے سلب کر لے۔

ب۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تفریق کو قانوناً ختم کر دیا جائے تاکہ اس بیہودہ طبقاتی تقسیم کے فتنے سے جملہ مسلمانوں کے حقوق مساوی ہو جائیں۔

ج۔ ایک ایسا زرعی قانون بنایا جائے جس کے ذریعہ مالکانِ زمین اور غیر مالک کاشتکاروں کے باہمی تعلق کو صحیح منصفانہ بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ جس کی رو سے مزارعت ہو تو سیدھی طرح اسلام کے اصولِ شراکت پر ہو، اور یہ طے ہو جائے کہ مزارعت کی کونسی شکلیں جائز ہوں گی اور کونسی ناجائز! مالک اور مزارع کے درمیان زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کس کس نسبت سے حصہ تقسیم ہو سکتا ہے۔ نقد کرایہ پر یا مزدوری پر کاشت کرائی جائے تو اس میں بھی مالک اور مستاجر اور مالک اور مزدور کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو جانا چاہئے۔ (فٹ نوٹ میں مولینا نے اشارۃً یہ ضرورت بھی ظاہر کی ہے کہ اصلاح احوال کے لئے اجرت اور کرایہ کی مقدار قانوناً مقرر کی جا سکتی ہے) یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ مالکانِ زمین کاشتکاروں سے اپنے حصے یا لگان کے علاوہ کوئی مال یا غلہ یا خدمات لینے کے مجاز نہ ہوں گے، ورنہ اس طرح کی حرکات جرم قابلِ دست اندازیِ پولیس ہوں گی۔ بے دخلی اور فسخِ معاملہ کے متعلق بھی قواعد مقرر ہونے چاہئیں کہ وہ کن کن صورتوں میں ہو سکتی ہیں اور کن کن صورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ نیز زمین کو بیکار ڈال رکھنے پر بھی شریعت کے احکام اور اسپرٹ کے مطابق پابندیاں عاید ہونی چاہئیں۔ تاکہ مالکانِ زمین کا یہ میلان کم ہو سکے کہ وہ کاشتکاروں سے من مانی شرطیں تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر کاشتکار نہیں مانتے تو اپنی زمین کو بیکار ڈال چھوڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی بندۂ خدا کو اس پر کام کرنے کا موقع دیں۔

د۔ شریعت کے قانونِ میراث کو زرعی جائدادوں کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہ۔ زرعی پیداوار کا عشر اور زمینداروں کے مواشی کی زکوٰۃ باقاعدہ وصول ہو۔

جس شخص نے ان ساری قانونی تدابیر کو اختیار کرنا لازم ٹھہرایا ہے، اس پر محض اخلاق کا وعظ

کہنے کا صفحہ دینا بہر حال زیادتی ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اس حصے کو بغور پڑھتے اور اس کے نتائج و اثرات کا باقاعدہ اندازہ کرتے[ا]۔

(۲) زمیندار اور کسان کی باہمی رضامندی پر معاملات کا انحصار آپ کو کھٹکتا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا یہ اصول آج بھی کار فرما ہے، اور اس کے نتائج سامنے ہیں۔ لیکن آپ اس چیز کو نظر انداز کر گئے کہ اسلامی نظام حکومت میں اس اصول کے ساتھ اور بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جو آج موجود نہیں ہے۔ اسلام مزارع کو یہ کہہ کر چھوڑ نہیں دیتا کہ جاؤ جیسے چاہو زمیندار سے معاملہ کرو، تم فارغ البال رہو یا مفلوک الحال، مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اصول ہے موجودہ نظام کا!

اسلامی نظام کا ایک بنیادی اصول "کفالتِ عامہ" (Social Insurance) کا اصول ہے۔ اس اصول کی رو سے ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اگر کوئی شخص بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہو یا ان کو پورا کرنے سے کم آمدنی حاصل کر رہا ہو تو وہ اپنے بیت المال سے اس کی ضروریات کو پورا کرے۔ اور اسی اصول کے ایک تقاضے کے طور پر اسلام میں جو حقوقِ محنت مقرر کیے گئے ہیں ان کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ جس سے محنت لے وہ اس کی ضروریات بھی پوری کرے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک مزارع کا معاملہ انصاف کے ساتھ کسی زمیندار سے طے نہیں ہو پاتا اور وہ بے روزگاری میں مبتلا رہتا ہے۔ اس دوران میں حکومت ضامن ہے کہ اسے اس کی ضروریات اس وقت تک پوری کر کے دے، جب تک کہ وہ خود اپنی کوشش یا حکومت کی مدد سے حد کفالت تک کا ذریعہ روزگار نہ پالے۔ دوسری طرف اگر ایک مزارع کو اس کی محنت کا معاوضہ اصولِ انصاف کے مطابق نہیں ملتا تو وہ اسلامی نظام عدالت کے سامنے اپنا استغاثہ لا سکتا ہے، اور وہ نظامِ عدالت "اصولِ کفالت" ہی کے ایک قانونی تقاضے کے تحت اس کی کم سے کم ضروریات کے بقدر معاوضہ کا اسے دلا سکتی ہے۔ آخر آج بھی تو یہ ایک عورت کو اس کا نان و نفقہ شوہر سے دلوا دیتی ہے۔

[ا] شاید یہ حصہ آپ کو اس لئے غیر اہم نظر آیا ہے کہ یہ بقول آپ کے صرف "آدھا صفحہ" (اور در حقیقت ۲½ صفحے) تھا۔

بالکل اسی طرح ہر محنت کار اپنے اور اپنے کنبے کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنا حق بذریعہ عدالت وصول کر سکتا ہے۔

یہ پشت پناہی کا نظام جو اسلامی ریاست میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اگر کہیں کارفرما ہو اور ایک محنت کار کے لئے صحت کا، تعلیم کا اور انصاف حاصل کرنے کا مفت انتظام موجود ہو نیز اسے بے روزگاری یا معذوری کی حالت میں یہ بھروسہ ہو کہ روٹی کپڑا اور مکان بہر حال اسے فراہم کیا جائیگا تو آخر وہ زمیندار سے گرگرمعاملہ کردیگا۔ کیوں؟ اسلامی ریاست کا اصولِ کفالت عامہ محنت کار کی قوت سودا بازی (Bargaining Power) کو موجودہ حالت کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھا دیگا۔

(۳) موجودہ نظام میں "چندوں" کا بنیادی فلسفہ ہی باطل ہے۔ آج چندہ لینے والے لیتے ہوئے اور دینے والے دیتے ہوئے یہ احساس رکھتے ہیں کہ یہ روپیہ کچھ اغراض کے لئے لگایا جا رہا ہے۔ چنانچہ دونوں طرف سے غیر شعوری طور پر ایک دوررس سودا ہوتا ہے۔ موجودہ ذہنیتوں کے ہوتے ہوئے اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ آج رضائے الٰہی سرے سے انفاق کی محرک ہی نہیں ہے، بلکہ ہے تو شہرت پسندی اور جاہ طلبی ہی ایک محرک ہے۔ لیکن اسلامی نظام تو ایسے چندوں سے اپنے "فنڈز" کو ناپاک بنانے سے بچائے گا۔ جن کے ساتھ رضائے الٰہی کی تمنا کے بجائے کسی طرح کی سوداگرانہ ذہنیت کے موجود ہونے کا سراغ مل جائے۔

جہاں تک محض "چندوں" اور حکومت و ملت کی مالی خدمات کے بل پر اسمبلی میں پہنچنے کا تعلق ہے، اس کے دروازے اسلامی نظام میں دوسری طرف سے بند ہو جائیں گے۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ آپ کے پارلیمانی نظام میں انتخابات اصولِ "امیدواری" (Candidatary) پر نہیں ہوں گے کہ سرمایہ دار آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کریں، اور پھر اسلامی انتخابات میں اخلاق و سیرت کے جن واضح بنیادی تقاضوں کو آئینی طور پر معیار کی حیثیت دی جائے گی، وہ خود سرمایہ دار کو اگلی صفوں سے اٹھا کر پچھلی صفوں میں منتقل کر دیں گے۔ ان بنیادی تبدیلیوں کے بعد محض روپے اور زمینداری کے بل پر اسمبلی کی رکنیت اور دوسرے عہدوں کا حصول ناممکن ہو جائیگا۔

باقی رہا یہ امر کہ ایک زمیندار یا کارخانہ دار جذبات صالحہ کے ساتھ اگر ریاست اور پبلک اور اپنے

محنت کاروں کی مالی اعانت کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی خدمات کی ایک قدر پیدا ہوتی ہے تو اس کے خلاف وجہ شکایت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک صاحبِ حیثیت آدمی کی مالی قوت کا یہی تو بہترین مصرف ہے۔ اگر وہ اس مصرف پر مال صرف کرتا ہے تو اسلامی معاشرہ میں اس کے حسنِ عمل کا اعتراف ہونا ہی چاہیے۔

(۴) یہ اصول آخر آپ نے کس اسلام اور کس قرآن اور کس ذخیرۂ حدیث سے اخذ کیا ہے۔ کہ ایک شخص اپنی محنت کے نتائج کے علاوہ اور کچھ لینے کا حقدار نہیں ہے؟ کیا آپ تحفے، ہدیے، ہبے، ضیافت، صدقہ، عطیہ وغیرہ سب کو اس اصول سے حرام قرار دے دینا چاہتے ہیں؟ اگر نہیں تو آخر ایک وراثت و توارث ہی کے خلاف اشتعال کیوں؟

بلاشبہ وراثت و توارث کا نظام معاشرہ کے مختلف افراد کے لیے مختلف قسم کے حالات زندگی فراہم کرتا ہے۔ لیکن آخر ذرائع و وسائل کا تفاوت انسانی زندگی میں ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ خود پیدائشی طور پر افرادِ انسانی کی عضوی، اور دماغی قوتیں اور صلاحیتیں، ان کا ماحول، ان کی خانگی تربیت کا نظام اور ان کی تعلیم، ان کی صحت، وغیرہ سبھی میں فطری تفاوت موجود ہے اور اسی طرح کا تفاوت آغازِ کار کرتے ہوئے سرمایہ و وسائل میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور ہونا چاہیے۔ بنائے فساد یہ نہیں ہے، بنائے فساد غیر اسلامی ذہن اور غیر اسلامی نظام ہوتا ہے جو اس تفاوت سے ناجائز فوائد حاصل کرنے کی راہیں کھولتا ہے اور افرادِ انسانی میں تعاونِ کار کے راستے بند کرتا ہے۔

(۵) یہ تصور کہ دوسرے کی محنت سے بالمعاوضہ استفادہ کرنا بھی حرام خوری ہے، کسی خدا ترس آدمی کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا جسے یہ یقین ہو کہ آج جو فتویٰ بھی وہ دے۔ اُسے اس کے بارے میں کل اسے اپنے حاکم کے سامنے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس فتوے کی بنیاد کتاب و سنت کی فلاں فلاں تصریحات پر تھی اور میں نے باقاعدہ تحقیق کرنے کے بعد زبان کھولی تھی!

اگر اس طرح کا کوئی اصول حق ہو سکتا ہے تو پھر کسی تانگے پر کرایہ دے کر بیٹھنا، کسی قلی سے سامان اٹھوانا، کسی مزدور کی بنائی ہوئی مصنوعات روپے سے خریدنا سب ناجائز ہوگا۔ اور اگر یہ سب جائز ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک شخص اپنی زمین کی کاشت ہی کے کام میں کسی شخص کو ملازم یا شریکِ کار یا مزدور کی حیثیت سے کسی معاوضے

سے استعمال نہ کرسکے۔

براہِ کرم "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کی وہ تفسیر اپنے ذہن سے نکال کر سوچیے جو کمیونسٹ مفسرینِ کرام نے گھڑ کے پیش کی ہے۔ اس تفسیر کو ماننے کے بعد آپ کو دورِ وحشت کی طرف لوٹ کر اپنے لئے نائی، دھوبی، ترکھان، جولاہا، موچی، لوہار، خاکروب وغیرہ سب کچھ خود ہی بننا ہوگا، اور ماں، باپ، بھائی، بہن، دوست، عزیز کسی کی محنت میں سے کچھ پانے کا حق نہ رہے گا۔

اِن مرعوب کن فلسفہ طرازیوں کا جب آپ باریک تجزیہ کریں گے تو ان کی مضحکہ خیزی آپ پر خود ہی کھل جائیگی۔

(۶) آپ کی تحریر سے اندازہ ہوا کہ آپ کو اسلامی قانونِ وراثت کے اُن امتیازی پہلوؤں سے تعارف نہیں ہے جن کا عمل سرمایہ دارانہ نظامِ وراثت کے بالکل متضاد دولت کو زیادہ سے زیادہ دور تک پھیلانے کا ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت کی حسب ذیل خصوصیات کو آپ نگاہ میں رکھ کر پھر سارے مسئلے کو سوچیے:

ا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں قانونِ وراثت ایک مرنے والے کا وارث بالعموم ایک ہی کو بناتا ہے تاکہ سمٹا ہوا خزانہ بدستور سمٹا رہے، اور ایک سانپ کی جگہ دوسرا سانپ اس کا چارج لے لے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانونِ وراثت ایک آدمی کی جمع کردہ دولت کو بہت سے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے تاکہ جمع شدہ مال پھر پھیل جائے۔

(ب) مستحقینِ وراثت کی اسلام نے تین صفیں قرار دی ہیں (۱) ذوی الفرائض (۲) عصبات (۳) ذوی الارحام۔ ان میں سے صرف پہلی صف میں ۱۲ رشتے شامل ہیں اور ان میں سے بھی ۶ ایسے ہیں کہ ان میں سے جو بھی زندہ ہو وہ بہرحال حصہ پاتا ہے۔ یہ ہیں: باپ، ماں، بیٹا، بیٹی، بیوی، شوہر۔ مثلاً ایک شخص مرتا ہے اور فرض کیجیے کہ اس کے ماں باپ زندہ ہیں، اس کی بیوی ہے، اس کے چھ بیٹے بیٹیاں ہیں تو اس کا ترکہ نو حصوں میں بٹے گا۔ نہ یہ کہ صرف بیٹوں کو ملے۔ پہلی صف میں مقررہ تناسب سے تقسیم ترکہ کرنے کے بعد جو حصہ بچ رہے۔ وہ عصبات میں تقسیم ہوتا ہے، نیز

اگر ذوی الفرائض موجود نہ ہوں تو اثرکہ عصبات میں بٹتا ہے، اور اس صنف کے شرکا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی نہ ہوں تو ذوی الارحام کی صنف ترکہ پاتی ہے۔ پس اسلامی قانون وراثت کے تحت دولت کے پھیلاؤ کا عمل زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

اوسطاً اگر آپ ہر ترکہ کے لئے مستحقین فرض کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک بڑی زمینداری یکدم آٹھ چھوٹی زمینداریوں میں بدل جائے گی۔

(ج) اسلامی قانونِ وراثت میں عورت بہ حیثیت ماں، بیٹی، بیوی اور بہن کے بھی اور دادی، پوتی، پھوپھی، بھتیجی، بھانجی ہونے کی حیثیت سے بھی ترکے میں مرد کے ساتھ شریک ہے۔ عورتیں ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں بیاہی جاتی ہیں تو اپنے ساتھ اپنے وراثتی حصے کو بھی لے کے جاتی ہیں، اس طرح ایک گھر کی دولت اور جائداد ایک ہی گھر میں نہیں رہتی۔ بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے پھیلاؤ کی رفتار اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔

اب آپ سوچیے کہ کجا یہ قانونِ وراثت اور کہاں سیٹھ ہارون صاحب کی جائداد کی تقسیم کی غیر اسلامی مثال کہ سب کچھ چار بیٹوں میں بٹ جائے۔

اس وقت تو ہر زمینداری میں کتنے ہی زندہ حقداروں کے حقوق وراثت شامل ہیں۔ اگر بروئے قانون ان کو محسوب کر کے حقداروں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو ایک ہی مرحلے میں زمینداریوں کے دس، دس، بیس بیس، چالیس چالیس ٹکڑے ہونگے۔ یہ جائز طریقہ دولتانہ رپورٹ[1]

---

[1] یہ بھی واضح رہے کہ اگر مزارعت اور بٹائی کا قاعدہ اسلام میں نہ ہوتا اور ہر شخص کے لئے صرف خود کاشت رقبہ رکھنے کا حق تسلیم کیا جاتا تو عورتوں کے حقوقِ وراثت زمین کی حد تک کسی طرح بحال نہ ہو سکتے۔ خود قانونِ وراثت ہی یہ شہادت دیتا ہے کہ اسلام میں مزارعت اور بٹائی کے اصول کا موجود ہونا ضروری ہے۔ شریعت اسلام نے دور دور کے مصالح کو نگاہ میں رکھ کر احکام دیئے ہیں۔

کے من گھڑت طریقے سے زیادہ مؤثر نتائج پیدا کرسکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی مسلمان دم نہیں مار سکتا۔

۷۔ مولینا مودودی نے اپنی کتاب لکھتے ہوئے جو اصل محور کلام پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ زمین کی ملکیت اور مزارعت وبٹائی کا اختلافی مسئلہ ہے۔ جیسے بہت سے حضرات چھیڑ کر قسم قسم کے غیر ذمہ دارانہ فتوے دے رہے ہیں۔ اس مسئلے پر مولینا نے اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ ضمناً انہوں نے یہ واضح کرنے کے لئے کہ زمین کی انفرادی ملکیت کو بحال رکھتے ہوئے بھی مزارعین سے انصاف کیا جا سکتا ہے۔ ایک باب " اصلاح کے حدود اور طریقے " کے عنوان سے سپرد قلم فرمایا ہے، اس باب سے آپ کو اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق صحیح APPROACH کے لئے رہنمائی مل سکتی ہے۔ اسکیم بہر حال الگ بنے گی۔

تاہم اس مختصر باب میں مولینا مودودی نے پوری بات کہہ دی ہے، اگرچہ صفحات کی تعداد کم استعمال کی ہے۔ آپ حاصل کلام کو دیکھئے نہ کہ تعدادِ صفحات کو۔

ان اشارات کو سامنے رکھ کر ایک مرتبہ پھر پوری کتاب کو پڑھیئے اور اگر کوئی چیز کھٹکے تو براہِ کرم اس کی نشاندہی کیجئے اور کتاب وسنت کے دلائل لے کر یہ واضح کیجئے کہ مولینا نے فلاں جگہ غلطی کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولینا کو کسی سچائی کے قبول کرنے میں اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ (ن م)

سونے کا نصاب

سوال:۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے عام طور سونے کا ۷½ تولہ اور چاندی کا نصاب ۵۲½ تولہ مشہور ہے۔ اس بنیاد پر دونوں کی قیمتوں میں جو نمایاں تفاوت نظر آتا ہے وہ اس توازن واعتدال کے خلاف ہے جو شریعت کے دوسرے احکام میں پایا جاتا ہے۔ امید ہے کہ اس خلش کو دور فرمائیں گے۔

جواب :-

سونے کے نصاب کے بارے میں ائمہ سلف میں تین مسلک پائے جاتے ہیں۔

(۱) ۲۰ دینار یا ۲۰ مثقال یعنی آج کل کے اندازے کے مطابق ۷½ تولے سے کم سونے پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ اکثر اہل علم کا رجحان اسی طرف ہے۔

(۲) سونے کا نصاب ۴۰ دینار ہے۔ یہ مسلک حسن بصری اور امام داؤد ظاہری کے اکثر تلامذہ نے اختیار کیا ہے۔

(۳) سونے کا فی نفسہ کوئی مستقل نصاب نہیں ہے۔ بلکہ وہ چاندی کے تابع ہے۔ یعنی جب سونے کی قیمت ۲۰۰ درہم (۵۲½ تولہ چاندی) کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہو جائیگی۔ عطار تابعی، طاؤس، ایوب سختیانی، سلیمان بن حرب اور امام زہری کا یہی مسلک ہے۔

راقم الحروف اپنی تحقیق میں اسی تیسرے مسلک کو اقرب الی الصواب پاتا ہے۔ اس مسلک کی تائید میں مندرجہ ذیل اشارات قابل غور ہیں۔

(۱) والذین لا یکنزون الذھب و الفضۃ و لاینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (سورۂ توبہ)	اور جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے ہیں اور پھر اس (چاندی) کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

عام مشہور نحوی قاعدے کے مطابق "ینفقونھما" ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن قرآن کریم کا یہ طرز بیان ایک دوسرے ضابطے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یعنی ضمیر تثنیہ کی جگہ ضمیر واحد کا استعمال بھی ہو سکتا ہے تاکہ اس طرح جو شے فی نفسہ مقصود اور اہم ہے اس کی نشان دہی کر دی جائے۔ اس کے نظائر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ملتے ہیں۔

(الف) واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ۔	اور اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہیں کہ لوگ اس (اللہ) کو راضی کریں۔

(ب) واذا رأو تجارة او لهوًا	اور جب وہ تجارت یا کھیل کود دیکھتے ہیں
انفضوا الیها	تو اُس (تجارت) کی طرف دوڑ پڑتے ہیں

اس اندازِ بیان سے پہلی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود بالذات رضائے الٰہی ہے، اور رضائے رسول صلے اللہ علیہ وسلم اس کے تابع ہے۔

اسی طرح دوسری آیت میں یہ بتلانا مقصود ہے۔ کہ ایک صالح متمدن سوسائٹی میں اہم اور نمایاں مقام لہو ولعب کا نہیں بلکہ تجارت کا ہے۔

یہی بات زیرِ نظر آیت میں بھی معلوم ہوتی ہے کہ زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے باب میں اصل بنیادی حیثیت چاندی کو حاصل ہے نہ کہ سونے کو۔ اس کی حیثیت تو محض تابع اور غیر مقصود شے کی سی ہے۔ اس لئے نصاب زکوٰۃ کے معاملہ میں سونے کو چاندی کے تابع ماننا قرآن مجید کے مذکورہ بالا حکیمانہ اشارہ کے زیادہ مناسب ہے۔

(۲) جمہور سلف نے سونے کے نصاب کی تعیین میں جن روایات پر اعتماد کیا ہے۔ ان کی صحت محدثین کے نزدیک مختلف فیہ ہے۔ ان میں سے کوئی روایت بھی ایسی نہیں جو ضعف سے خالی ہو۔

امام ابنِ عبدالبر لکھتے ہیں:۔

لم یثبت عن النبی صلی اللہ	سونے کی زکوٰۃ کے بارے میں آنحضرت
علیہ وسلم فی زکوٰۃ الذھب	سے ثقہ راویوں کے ذریعہ کچھ بھی ثابت
شیٔ من جھۃ نقل الاحاد	نہیں ہے۔
الثقات	سُبُل السلام ج ۲ ص۱۲۲۔

یعنی سونے کے نصاب کی تعیین کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں۔ باقی رہا سونے میں زکوٰۃ کی فرضیت کا ثبوت تو وہ خود قرآن حکیم اور بخاری، مسلم کی روایات سے ملتا ہے۔

(۴) مذکورہ بالا تفصیل سامنے رکھتے ہوئے تقویٰ اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس پہلو کو ترجیح دی جائے جس سے مساکین و فقراء کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور مال کی کم سے کم مقدار جمع ہو سکے

(ع - ح)

مطبوعات

ناموسِ ملت معروف بہ پردہ اور اسلام از جناب منشی خادم علی خاں اختر، بی۔ اے، ایل، ایل بی۔ ضخامت ۲۰ صفحے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی متوسط۔ ملنے کا پتہ ادارہ مستقبل۔ ٹبی شیر خاں نمبر ۲۳۲ ملتان شہر۔

اِس مختصر رسالے میں پردہ کی اہمیت اور بے پردگی کے مفاسد نہایت مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

دورِ جدید کے "روشن خیال" منکرین پردے پر جو اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کا مدلل اور معقول جواب دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں مصنف نے مخالفین پردہ کو نہایت سخت اور عریاں الفاظ میں مخاطب کیا ہے جو حکمتِ دعوت و اصلاح کے یکسر منافی ہے۔

مشکل الفاظ اور عربی، فارسی ترکیبوں پر مشتمل استفسارات کے بجائے اگر سہل اور سنجیدہ انداز اختیار کیا جاتا تو کتاب کی افادی حیثیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

ع - ح

مکتبہ چراغِ راہ کراچی کی مندرجہ ذیل کتب مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی سے مل سکتی ہیں۔

دیارِ عرب از مسعود عالم صاحب ندوی	۴/۸/-	قومی ملکیت از نعیم صدیقی صاحب	[illegible]
اشتراکیت اور اسلام	OUR LEADERS. ۴/۸/-	از چوہدری محمد اکبر	[illegible]
محمد بن عبدالوہاب	۲/۱۲/-		

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

مسئلہ ملکیت زمین

- زمین کی شخصی ملکیت از روئے قرآن
- زمین کی شخصی ملکیت از روئے حدیث
- مزارعت کا مسئلہ
- اصطلاح کے حدود اور طریقے

★

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ
مکتبہ جماعت اسلامی
اچھرہ لاہور (پاکستان)